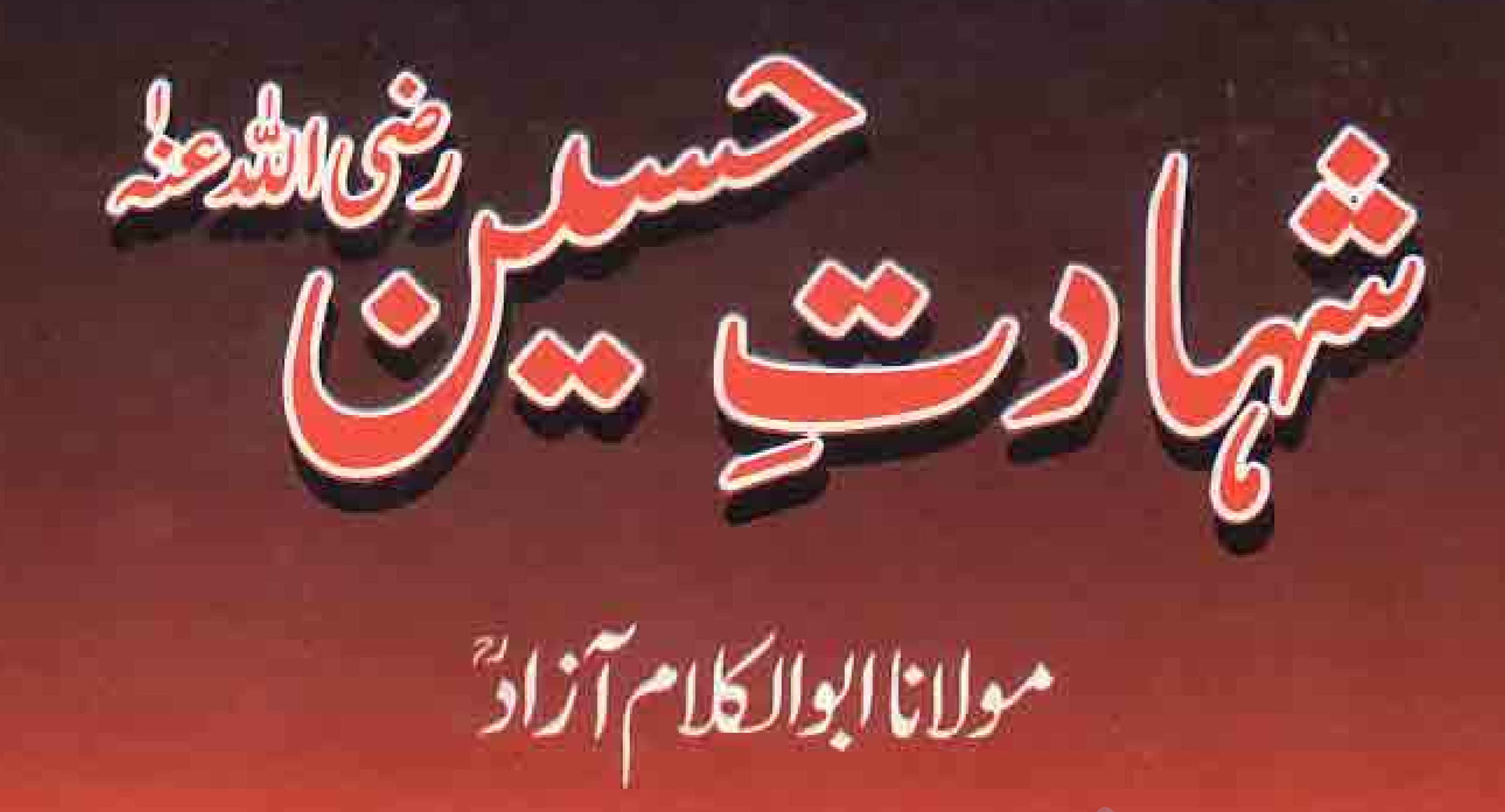


شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ

نام کتاب: .... شہادت حسین رضی اللہ عنہ

مصنف: .... مولانا ابوالکلام آزاد

اہتمام: .... میاں غلام مرتضےٰ کھٹانہ

ناشر: .... مکتبہ جمال ٥ لاہور

مطبع: .... تایا سنز پرنٹرز ٥ لاہور

سن اشاعت: 2010

قیمت: .... 80 روپے

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جمال

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 7232731 Mob: 0300-8834610

Email: maktabajamal@yahoo.co.uk

maktaba_ jamal@email.com




شہادت حسین [1]

یعنے

واقعہ عظیمہ شہادت حضرت سید الشہداء علیہ و علیٰ آبائہ الصلوٰۃ و السلام پر ایک درس بصیرت........... جو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ۵ محرم الحرام ۱۳۳۴ ہجری المقدس بمطابق ۱۳۔ نومبر 1915 عیسوی کو مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ کے ایک غیر معمولی جلسہ میں دیا۔

[1] جیسا کہ قارئین کرام کو معلوم ہے، یہ عاجز تحریری تقریروں کا بالکل عادی نہیں۔ حتیٰ کہ تقریر کے وقت کسی طرح کے نوٹ یا اشارات بھی پیش نظر نہیں رکھتا۔ محض اپنے حافظہ اور پیش نظر مطالب کے اعتماد پر کھڑا ہو جاتا ہوں اور پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ زبان پر جاری کر دیتا ہے، وہی تقریر ہوتی ہے۔ پس یہ لیکچر بھی محض زبانی تھا۔ ایک عزیز نے اپنے شوق سے اس کے کچھ نوٹ مرتب کر لیے تھے وہ اس وقت دیکھ لیے ہیں اور انھی کو ایک مرتب مضمون کی شکل میں تحریر کر دیتا ہوں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تقریر کا اصلی انداز ترتیب یا طرز درس وخطاب تحریر میں کب لایا جا سکتا ہے؟

فہرست

خطابہ الم وتوصیہ شہادت

سرچشمہ اسرار شریعت اسلامیہ

یادگاروں کا دائمی قیام

قرآن اور قیام یادگار

موعظت وعبرت آموزی کا سبق

خطابۂ الم و توصیۂ شہادت

شمع ها بُرده ام از صدق بخاک شهد اء

تادلِ و دیدۂ خوننابہ فشانم دادند!

عظیم الشان واقعہ

برادران عزیز!

آج جس حادثہ کبریٰ اور شہادتِ عظمیٰ کے تذکار و درس کے لیے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ وقائع و حوادث اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے، جو تاریخ اسلام کی اولین صدی سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب وغریب تاثیر ماتم و درد اور حیرت انگیز بقائے ذکر و تاثیر کے لحاظ سے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تمام حوادث محزنۂ عالم میں ایک عدیم النظیر رکھتا ہے۔

اگر وہ تمام آنسو جمع کیے جائیں جو ۶۱ ہجری سے لے کر اس وقت تک اس واقعہ جاں سوز پر بہائے گئے ہیں، اگر وہ تمام دردآہ و فغاں سوزاں یک جا کیا جا سکے جو ان تیرہ صدیوں کی لاتعد و لاتحصیٰ اسلامی نسلوں کی صداہائے ماتم کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے، اگر درد و کرب کی وہ تمام چیخیں، اضطراب و الم کی وہ تمام پکاریں، سوزش و تپش کی وہ تمام بے

قراریاں، اکٹھی کی جا سکیں جو اس حادثہ کبریٰ کی یاد نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں، تو اے عزیزان ماتم شعار! کون کہہ سکتا ہے کہ خون فشاں ہائے حسرت کا ایک نیا اٹلانٹک واوقیانوس سطح ارضی پر بہہ نہ جائے گا؟ درد آہ وفغاں کی ہزارہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی؟ اور درد والم کی چیخوں، حسرت کی صداؤں، تڑپ کی بے چینیوں کے ہنگامۂ خونین سے تمام عالم ایک شورزار نالۂ وبکا نہ بن جائے گا؟

پیام غم واضطراب

تاہم میں جو پیام پہنچانے کے لیے آج آیا ہوں، وہ اس تذکرہ سے بالکل مختلف ہے۔ میں غم والم کی شدت وکثرت کے اعتراف کی تاریخ نہیں ہوں، بلکہ اس عدیم النظیر شدت وکثرت کے بعد بھی آنسوؤں کی طلب ہوں، آہوں کی صدا ہوں، بیقراری کی پکار ہوں، اضطراب کی دعوت ہوں اور آہ! آہ! اے صد ہزار آہ وحرماں کہ غم کے لیے بھوکا ہوں اور درد والم کے لیے ایک قلم پیاس ہوں۔

تلاش قلب مضطر

پس میں آج ان آنکھوں کا تذکرہ نہیں کرتا جو بہت رو چکی ہیں، مجھے ان آنکھوں کا سراغ بتلاؤ جو اب بھی رونے کے لیے نم آلود ہیں! میں ان دلوں کی سرگذشت نہیں سناتا، جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہوں، میں ان دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں جو اب بھی تہ وبالا ہونے کے لیے مضطرب ہیں! مجھے ان زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنجی ہائے ماضی کا ادعا ہے! آہ! میں تو ان زبانوں کے لیے پکار رہا ہوں جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہوں، اور ان کا دھواں آج بھی کائنات نشاطِ نادانی کی اس تمام فضائے غفلت کو مکدر کر دے سکتا ہے، جس کو عیش وعشرت کے قہقہوں میں درد وعبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں!

نہ داغ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کارد!
بدہ یارب دلے، کیں صورت بے جاں نمی خواہم!

ہنگامہ غم کی مجلس طرازی

ہاں، یہ سچ ہے کہ رونے والے اس پر بہت روئے، ماتم کرنے والوں نے ماتم میں کمی نہ کی، آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ ہنگامہ الم کی مجلس طرازیاں کیں، اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہو چکا ہے، جتنا آج تک شاید ہی دنیا کے کسی حادثہ غم کو نصیب ہوا ہو۔

طلب حقیقی سے محروم

تاہم تم یقین کرو کہ با ایں ہمہ اس حادثۂ عظیمہ کی دعوت اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دعوت درد کے اندر جو حقیقی طلب تھی، وہ اب تک لبیک کے سچے استقبال سے محروم ہے۔

خون شہادت کی پکار

تیرہ صدیاں مع اپنے دوران محرم و عشرہ ماتم کے اس پر گزر چکی ہیں، لیکن اب تک خاک کربلا کے وہ ذرات خون آشام، جن کو آج بھی اگر نچوڑا جائے تو خون شہادت کے مقدس قطرے اس سے ٹپک سکتے ہیں، بدستور آنسوؤں کے لیے پکار رہے ہیں، خون فشانیوں کے لیے داعی ہیں، آہ و فغاں کے لیے تشنہ ہیں، اضطراب و التہاب کے لیے بے قرار ہیں اور فضاء ریگ زار کرب و بلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشک فشاں، جگر ہائے سوختہ، دلہائے دونیم اور زبان ہائے ماتم سرا کے لیے اسی طرح چشم براہ ہے، جس طرح ۶۱ ھ کی ایک آتش خیز دوپہر میں خون کی ندیوں کی روانی، تڑپتی ہوئی لاشوں کے ہنگامہ احتضار، اور ظلم و مظلومی، جرح و محرومی، قتل و مقتولی کی ہنگامہ الیم کے اندر سے نالہ ساز طلب اور فغاں فرمائے دعوت تھا!

شدیم خاک ولیکن بوئے تربت ما

تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد!

حقیقت ناشناسی

لیکن اگر یہ دعوت درد محض اس پانی کے لیے ہے جو ندیوں کی جگہ آنکھوں سے بہے، اگر یہ طلب غم محض ان صداؤں کے لیے جن کا غوغا درختوں کے جھنڈ، چڑیوں کے گھونسلوں، دریاؤں کی سیران کی جگہ انسانوں کی زبانوں سے بلند ہو، اگر یہ انتظار الم محض اس ماتم کے لیے ہے جو پتھروں کے ٹکرانے کی جگہ انسانی دست وسینہ کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہو، تو اے برادران غفلت شعار! اور اے چشمان خواب آلود! بلاشبہ یہ سب کچھ ہو چکا، اور بلاشبہ سوال کو جواب، دعوت کو لبیک اور طلب کو مطلوب مل چکا!

حقائق سے چشم پوشی

اگر انسان کا بچہ بھوک سے روتا اور روٹی کے لیے آنکھوں کو سرخ کر لیتا ہے، تو انسانوں کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں آنسو بہا سکتے؟

اگر درختوں کے جھنڈ ہوا سے ہل کر چند لمحوں کے لیے دنیا کو شور وغوغا سے لبریز کر دے سکتے ہیں، تو آدم کی اولاد اپنے آہ و بکا سے کیوں آسمان کو سر پر نہیں اٹھا سکتی؟

اگر بے جان و بے روح پتھر دوسرے پتھر پر گر کر رعد و برق کا ہنگامہ پیدا کر دے سکتا ہے، تم تم کہ روح و ارادہ رکھتے ہو، اپنے دست ہائے ماتم کناں سے کیوں ایک ہنگامہ زار دہشت گرم نہیں کر سکتے؟

مظاہرہ ریاکوشی

کیا تم کو دنیا کی ان آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں، حالانکہ ان سے ایک آنسو بھی نہیں

بہا؟ کیا تم نے ان زبانوں کے متعلق کچھ نہیں سنا جو چیختی ہیں حالانکہ انہوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے ان جسموں کا تماشا نہیں دیکھا جو تہ و بالا ہوتے ہیں حالانکہ ان کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؟

فقدان حقیقت

پھر کیا تم اس غفلت آباد ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں جو گو دل ہیں، مگر دل نہیں ہیں، کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے؟ کیا وہ کان بھی نہیں ہیں، جو گو سامع ہیں مگر کان نہیں، کیونکہ سنتے نہیں ہیں؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں جو گو بصیر ہیں مگر آنکھیں نہیں ہیں، کیونکہ نہیں دیکھتیں؟

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّايُبْصِرُوْنَ بِهَا، وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّايَسْمَعُوْنَ بِهَا، اُولٰٓئِكَ كَالْاَ نْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ (۷: ۱۷۹)

ان کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے ہیں۔ وہ (عقل و حواس کا استعمال کھو کر) چارپایوں کی طرح ہو گئے، بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو سرتاسر غفلت میں ڈوب گئے۔

مجالس غم کی بے اثری

پس اے عزیزان من! درد و الم کی یہ پاک دعوتیں صرف اس روانی آب تسلسل صدا اور ہنگامہ غوغائی کے لیے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں، فغانوں اور ماتموں کے نام سے ظہور میں آ جائیں۔ اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لیے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں، اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں۔

دعوت کی رُوح رواں

بلکہ یہ دعوت، یہ پکار، یہ طلب، یہ ھل من مجیب، فی الحقیقت ان آنسوؤں کے لیے ہے جو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ دل سے نہیں، وہ ان آہوں کا دھواں مانگتی ہے جن کی لٹیں صرف منہ ہی سے نہیں بلکہ اعماق قلب سے اٹھیں، وہ صرف ہاتھوں ہی کے ماتم کے لیے نہیں پکارتی بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت کے لیے تشنہ ہے۔ اگر تمہارے پاس اس کے لیے آنکھوں کا آنسو نہ ہوتو اسے کوئی شکایت نہیں، لیکن آہ تمہاری غفلت، اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو جس سے پانی کی جگہ خون بہے! اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آہ! یہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس، عبرت کی ایک ٹپک، بصیرت کی ایک تڑپ، احساس صحیح وحق کا ایک اضطراب بھی نہیں ہے؟

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

دوست ودشمن کی سعی ناکام

اللہ اللہ، سید الشہداء مظلوم کی مظلومی اور یاللعجب غفلت ونادانی کی بوقلمونی!! اس سے بڑھ کر دنیا میں مظلومی کی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں، دونوں نے اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادت عظیمہ کی عظمت مٹانی چاہی، مگر دوستوں نے بھی اس کی شہادت کی اصلی حقیقت وبصیرت سے غفلت کی۔ دشمنوں نے اس پر ظلم کیا، کیونکہ اس کی مظلومی پر انھیں رونا نہ آیا، پر ان دوستوں نے بھی ظلم کیا ۲۱ جو گو روئے، مگر اس کی اصلی تقدیس وشرف کے لیے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہا سکے۔ دشمن تو

دشمن تھے، اس لیے انھوں نے اس کی دعوت حق کو مٹانا چاہا، مگر دوست، دوست ہو کر بھی اس کی دعوت کی پیروی نہ کر سکے:

وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۵۶:۸۵)

(اے پیغمبر!) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے رستے بلاؤ تو کبھی تمھاری پکار نہ سنیں۔ تمہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمھاری طرف تک رہے ہیں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہیں دیکھتے نہیں

دل کی حیات جاودانی

پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ ہی کا نہیں، بلکہ دل کا ماتم ہو اور دعوت درد کا اصلی جواب وہی ہے جو عبرت و بصیرت کی زبان سے نکلے۔ تمھاری آنکھیں اس حادثے پر بہت رو چکی ہیں، مگر اب تک تمھارے دل کا رونا باقی ہے اور اگر رونا ہے تو اپنے دل کو رولاؤ! اور نہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجیے جس میں دل کی ایک اشک افشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے، حالانکہ انسان کی ساری کائنات حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے:

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ، وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲ : ۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ (جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے تو) آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں (جو سروں میں ہیں)، دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے کے اندر پوشیدہ ہیں۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ، تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

نئی صف ماتم

آج ہمارا اجتماع اس لیے ہے کہ اس حادثہ عظیمہ پر غور و فکر کی ایک نئی صف ماتم بچھائیں اور ان حقیقتوں اور بصیرتوں کی جستجو میں نکلیں جن پر آنکھوں کی اشک افشانیوں سے زیادہ دل کے زخموں سے خون بہتا ہے اور ہاتھوں سے زیادہ روح پر ماتم طاری ہوتا ہے:

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۱:۵۵)

اور ذکر کرو کہ ذکر صاحبان ایمان کے لیے ضروری نفع بخش ہے۔

سرچشمۂ اسرار شریعت اسلامیہ

مشاہیر کی یادگار کا طریقہ

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خون آلود حرفوں میں لکھا گیا اور اشکبار آنکھوں سے پڑھا گیا ہے۔ لیکن اس دردانگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعت اسلامیہ کی بے شمار بصیرتیں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا اور ہزاروں اسوہ ہائے حسنہ مخفی تھے جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہالے گئے!

نتیجہ خیز طریقہ ماتم

اس لیے اب ہم کو قدیم زمانے کی مجلس ہائے ماتم میں ایک نئے حلقہ ماتم کا اضافہ کرنا چاہیے اور خون آلود آنسوؤں کا جو چشمہ ہمارے زخم رسیدہ دلوں سے ابل رہا تھا، اس کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر کے خود واقعہ شہادت کو اسرار شریعت اسلامیہ کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر ماتم کرنے کا یہ ایک نتیجہ خیز طریق ہوگا اور شریعت نے امت محمدیہ کو اسی قسم کے طریق ماتم کی ہدایت فرمائی ہے۔

مقبول ترین طریقہ یادگار

دنیا میں اسلاف پرستی کا فطری مادہ ہر قوم کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اسی بناء پر تمام قوموں نے اپنے اپنے اسلاف کا ماتم مختلف طریقوں سے منایا ہے اور ان کے اعمال کو

آئندہ نسل کی عبرت وبصیرت کے لیے زندہ رکھنا چاہا ہے۔ لیکن ان تمام طریقوں میں جو طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا، وہ وہی ہے جس کی بنیاد دنیا کی بت پرستی نے رکھی اور دراصل اصنام پرستی کی زنجیر عمل کی پہلی اور آخری کڑی اسی کو سمجھنا چاہیے۔ پہلی اس لیے کہ بسا اوقات انسانوں نے اسی راہ سے اصنام پرستی کی منزل پائی اور آخری اس لیے کہ بت پرستی خود تو چلی گئی مگر اپنا نقش قدم اس شکل میں اب تک چھوڑ گئی ہے۔

ہمارا اشارہ اسلاف پرستی کے اس طریقہ کی طرف ہے جس کی بنا پر مشاہیر ملک وقوم کے مجسمے (اسٹیچوز) بنائے جاتے ہیں اور ان کو اس لیے نصب کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ قوم کو ہمیشہ مشاہیر کی یاد دلائی جائے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت ملے۔

یونانی ومصری تہذیب کی آمیزش

اگرچہ اسلاف پرستی کا یہ نہایت قدیم طریقہ تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک اس قسم کے متعدد مجسمے قائم ہو چکے تھے اور ان کی علانیہ پرستش کی جاتی تھی۔ لیکن یونان ومصر نے ان مجسموں پر تمدن وتہذیب کا آب ورنگ چڑھا کر ان کو اور بھی شاندار اور دلفریب بنا دیا۔ آج یورپ بانیان تہذیب وتمدن کے دیوتاؤں کی جو نمائش مجسموں کی شکل میں کر رہا ہے، ان کے اندر یونان کی اس قدیم تہذیب کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی سطح پر بھی تصویروں کی جو صفیں نظر آ رہی ہیں، ان میں بھی اسی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

طریقہ قیام ذکر وبقائے عظمت

لیکن اسلام ایک دین خالص ہے، جو توحید خالص کو قائم کرنا چاہتا تھا اور انسانی عظمت کی ان تمام راہوں کا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند کر دینا چاہتا تھا، جو کسی حال میں

بھی الٰہی عظمت کے نقطہ تک نہ پہنچ سکتی تھیں یا قریب ہو سکتی تھیں۔ پس وہ کسی طرح بھی قیام ذکر و بقائے عظمت کا ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا جس میں پڑ کر دنیا بار بار ٹھوکر کھا چکی تھی۔

اسلام نے ظاہر ہوتے ہی دنیا کے تمام اعمال و معمولات پر نظر ڈالی اور ہر عمل کی حقیقت وروح کو لے لیا اور غیر مناسب و ناموزوں جسم ولباس کو چھوڑ دیا

حقیقت بے نقاب ہوگئی

وحشت نے جن حقیقتوں کو تاریک پردوں میں چھپا دیا تھا وہ دفعۃً چاک چاک ہو گئے، جہالت نے جن موتیوں کو پتھروں کے ڈھیر میں گم کر دیا تھا، وہ ان سے الگ ہو کر دنیا میں دامن مراد میں آ گئے، غیر معتدل تمدن نے جن کھلی ہوئی بصیرتوں کو خوشنما چادروں کے آب و رنگ میں راز سربستہ کی طرح مقفل کر دیا تھا، وہ یکسر خاموش ہو گئے اور حقیقت آفتاب کی طرح علانیہ بے نقاب ہو کر ہر انسان کو نظر آ گئی۔ قرآن حکیم نے اسی انقلاب کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے!

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ، وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَوْلِیَآءُ هُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ. (۲:۲۵۷)

اللہ ان لوگوں کا ساتھی و مددگار ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انھیں (ہر طرح کی) تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے، مگر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو ان کے مددگار سرکش اور مفسد (معبودان باطل) ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکالتے اور تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔

روحانی انقلاب

یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا جس کی جھلک اسلام کی تمام تعلیمات میں نظر آتی ہے اور مشاہیر پر ماتم کرنے کا طریقہ بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔ چنانچہ قدماء کی یادگار قائم کرنے اور ان کے اعمال و آثار کے زندہ رکھنے کا جو طریقہ زمانہ قدیم سے چلا آتا تھا، اسلام نے اس میں بھی ایک روحانی انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کو مجسموں کی شکل میں اسلاف پرستی کی اجازت نہیں دی، کیونکہ وہ بت پرستی تک منجر ہوتی ہے اور اسلام زندہ انسانوں کے شرف کو پتھروں کے آگے نہیں جھکانا چاہتا، مگر اس نے مشاہیر کرام اور اسلاف صالحین کے نمونوں کے فوائدِ عظیمہ کو بھی ضائع ہونے نہ دیا۔ اور ان کے اثر کو اس طرح حی و قیوم کر دیا کہ ہر مومن کے آگے ان کے عملی زندگی کے نمونے پیش کر دیئے اور کہا کہ دن میں پانچ بار جب خدا کے حضور آؤ تو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت مانگو۔

صراطِ مستقیم

ساتھ ہی تشریح کر دی کہ صراط مستقیم انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ علم و عمل ہے اور اس لیے ان کے نمونے ہر وقت تمہارے سامنے رہنے چاہئیں۔ (یہ نہایت اہم مقام ہے۔ اس کی پوری تفصیل تفسیر سورۂ فاتحہ میں دیکھنی چاہیے۔)

رسم ماتم کی حقیقت

پس ماتم کی رسم پر وحشت نے جن تاریک پردوں کو ڈال کر اصل حقیقت کو چھپا دیا تھا اور تمدن و تہذیب نے ان پردوں پر نظر فریب رنگ چڑھا کر جن بصیرتوں کو گم کر دیا تھا، اسلام نے ان سب کو چاک چاک کر دیا اور مغز حقیقت جن چھلکوں میں چھپا ہوا تھا۔ ان سے نکل کر علانیہ آشکارا ہو گیا۔

قرآن مجید اور قیام یادگار

قرآن حکیم میں انبیائے سابقین کے جو قصص مذکور ہیں، ان کے اندر درحقیقت انھیں بصائر دحکم کی روح مضمر ہے جو مجسموں کے قالب میں حلول کر کے بالکل بے اثر اور محض ظاہر فریب ہو جاتی تھی۔ قرآن مجید قدماء و اعاظم رجال کی یادگاروں کے قائم کرنے کے اصل مقصد کو ''اسوۂ حسنہ'' کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور مسلمانوں کو جابجا اس پر توجہ دلاتا ہے چنانچہ تم بار بار انہی صفحات پر پڑھ چکے ہو کہ اس نے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے نمونہ حیات کو مسلمانوں کا قبلۂ وجوہ و کعبہ انظار قرار دیا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرَاهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ (۶۰:۴)

تمہارے لیے حضرت ابراہیمؑ کی حیات طیبہ میں اور ان کی زندگی میں جو ان کے ساتھی ہیں، پیروی کے لیے بہترین نمونہ رکھا گیا ہے۔

واقعہ شہادت اور اسلام

اس بنا پر اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو اسلاف پرستی کے صحیح اصول پر اسلامی تعلیم دیتا ہے اور اسی صحیح اصول کے مطابق چاہئے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ شہادت کے اندر عزم و استقلال، صبر و ثبات، استبداد شکنی، قیام جمہوریت، امر بالمعروف، ونہی عن المنکر کی جو عظیم الشان بصیرتیں موجود ہیں، ان کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھیں اور کم از کم سال میں ایک بار اس مذہبی قربانی کی روح کو تمام قوم میں ساری و جاری کر دیں۔

لیکن ان بصیرتوں کے علاوہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ذات میں ایک اور عظیم الشان بصیرت موجود ہے، جس کا سلسلہ مذہب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور اس کی آخری کڑی اسلام کی تکمیل سے جا کر مل جاتی ہے۔

تاریخ اور روحانی عالم کا تضاد

دنیا کی مذہبی تاریخ کی ابتداء عجیب بیکسی کی حالت میں ہوئی۔ ہم نے دنیا کے سخت سے سخت معرکوں میں باپ کو بیٹے کا شریک، بھائی کو بھائی کا حامی، بی بی کو شوہر کا مددگار پایا ہے۔ لیکن صرف مذہب ہی کا روحانی عالم ایک ایسا عالم ہے، جہاں باپ کو بیٹے نے، بھائی کو بھائی نے، شوہر کو بی بی نے چھوڑ دیا ہے، بلکہ ان کی مصیبتوں میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔

اعانت اقارب سے محرومی

یہی سبب ہے کہ خاندان نبوت ہمیشہ اعزہ واقارب کی اعانت سے محروم رہا۔ حضرت نوحؑ علیہ السلام نے ایک مدت تک شب و روز اپنی قوم کو دعوت توحید دی اور قوم نے فرط بغض و عناد سے ان کی دعوت حق کو رد کر دیا، ان سے علیحدگی اختیار کر لی اور کانوں میں انگلیاں تک دے لیں:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلاً وَّنَهَارًا، فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا، وَاِنِّیۡ کُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ، جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَهُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَکۡبَرُوا اسۡتِکۡبَارًا۔ (۷۱:۵تا۷)

نوح نے عرض کیا: خداوندا! میں نے شب و روز اپنی قوم کو دعوت حق دی۔ لیکن اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ لوگ مجھ سے اور زیادہ بھاگنے لگے۔ میں نے جب ان کو تیری مغفرت کے لیے پکارا، انھوں نے کانوں میں اپنی

انگلیاں دے لیں اور اپنے کپڑوں میں لپٹ گئے کہ ان تک میری آواز نہ پہنچ جائے، آہ، یہ حق ناشناس قوم ہمیشہ ہٹ دھرمی اور باطل پرستانہ گھمنڈ کا اظہار کرتی رہی!

نوح علیہ السلام کی پیغمبرانہ آواز کی بازگشت

لیکن اس پیغمبرانہ آواز کی صدائے بازگشت صرف ان کی قوم ہی کے درودیوار سے ٹکر کرنا کامیاب واپس نہیں آئی، بلکہ خود ان کی گھر کے درودیوار نے بھی اس کو ٹھوکر لگائی اور خاندان نبوت کے چشم و چراغ یعنی ان کے بیٹے نے بھی اس نور کو قبول نہ کیا۔ آخری وقت میں حضرت نوح علیہ السلام نے پھر اپنے بیٹے کو خدا کی پناہ میں بلایا، لیکن اس وقت بھی اس کا گوش نصیحت نیوش وا نہ ہوا۔ اس لیے وہ بھی تمام قوم کے ساتھ عذاب کی طوفان خیز موجوں میں بہہ گیا:

وَنَادٰی نُوْحُ ۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِیْ مَعْزِلٍ : يّٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ، قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ، قَالَ لَاعَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ. وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ (۱۱:۴۲)

اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا، وہ کنارہ پر کھڑا تھا: اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا، کافروں کا ساتھ نہ دے! اس نے کہا: کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا، وہ مجھے پانی کی زد سے بچا لے گا۔ نوحؑ نے کہا: (تو کس خیال خام میں پڑا ہے؟) آج اللہ کی (ٹھہرائی ہوئی) بات سے بچانے والا کوئی نہیں، مگر ہاں! وہی جس پر رحم کرے اور (دیکھو!) دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہوگئی، پس وہ انہیں میں ہوا جو ڈوبنے والے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی

حضرت لوط علیہ السلام کے تمام خاندان نے اگر چہ ان کا ساتھ دیا، لیکن خود ان کی بی بی ان سے علٰحیدہ ہو کر تمام قوم کے ساتھ عذاب الٰہی میں شامل ہو گئی:

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰی قَوْمٍ مُّجْرِمِیْنَ، اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوْھُمْ اَجْمَعِیْنَ، اِلَّا امْرَاَتَہٗ قَدَّرْنَآ اِنَّھَا لَمِنَ الْغٰبِرِیْنَ

(۱۵:۵۸تا۶۰)

انھوں نے کہا: ہم ایک مجرم گروہ کی طرف بھیجے گئے ہیں (کہ ہلاک ہونے والا ہے) مگر (ہاں) ایک خاندان وہاں لوط کا ہے۔ اس کے تمام افراد کو ہم بچا لیں گے۔ البتہ اس کی بیوی نہیں بچے گی اس کے لیے ہمارہ اندازہ ہو چکا وہ پیچھے رہ جانے والوں کا ساتھ دے گی۔

عظیم الشان قربانی

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے خاندان نبوت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ان سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا بیٹا ان سے علٰحیدہ ہو گیا تھا، حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس دور ابراہیمی میں بیٹے نے باپ کی، بی بی نے شوہر کی، بھائی نے بھائی کی دعوت حق پر لبیک کی صدا بلند کی اور اس دعوت کی اشاعت میں جو جو مصیبتیں ان پر پیش آئیں، ان میں برابر کے شریک رہے۔ سب سے پہلے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس جہاد روحانی کی طرف قدم بڑھایا اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے لخت جگر کو ایک ''وادی غیر ذی زرع'' میں ڈال دیا۔ جہاں کئی سو میل تک آب و گیاہ کا پتہ نہ تھا۔ یہ اسی سخت امتحان کی پہلی منزل تھی، جس کے لیے خداوند تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ

السلام کا انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ جب اس آخری امتحان کا وقت آیا تو انھوں نے باپ کے آگے سر اطاعت خم کر دیا:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّيٓ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؟ قَالَ يَآ أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ. فَلَمَّآ أَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَ نَادَيْنٰهُ أَنْ يَّآ إِبْرَاهِيْمُ! قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا، إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَآءُ الْمُبِيْنُ (۳۷:۱۰۲تا۱۰۶)

جب اسمٰعیل حضرت ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو انھوں نے ایک دن کہا: اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا تمھیں راہ حق میں ذبح کر رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ تم بھی اس پر غور کرو کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ بیٹے نے بلا تامل کہا، اے میرے باپ اس خواب سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک اشارہ ہے۔ پس آپ حکم کو پورا کیجیے، مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں اور ثابت قدموں میں سے پائیے گا۔ جب باپ بیٹے دونوں خدا کے آگے جھک گئے اور باپ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو زمین پر پچھاڑا تو اس وقت ہم نے آواز دی: اے ابراہیمؑ بس کرو، تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم صاحبان احسان کو اسی طرح بدلا دیتے ہیں۔ دراصل یہ ایک بہت ہی بڑی قربانی تھی جس کی تعمیل کے لیے تم تیار ہو گئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اعانت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ان کے خاندان کی اعانت ورفاقت شریک رہی۔ چنانچہ جب ان کو شعلہ طور کی زبان نے بشارت نبوت دی تو ان کی بی بی ان کے ساتھ تھیں۔ بلکہ انھیں کے لیے وہ آتشکدۂ طور سے آگ لینے گئے تھے:

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا، قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ. (۲۹:۲۸)

جب موسیٰ مدین سے اپنی بی بی کو لے کر چلے تو ان کو کوہ طور کے دامن میں آگ کی روشنی نظر آئی۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا: یہیں ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، اس کا پتہ لگاتا ہوں، شاید تمہارے تاپنے کے لیے آگ حاصل کرسکوں۔

لیکن وادی ایمن میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ آگ کا شعلہ نہ تھا بلکہ وہ ایک برق خاطف تھی جو فرعون کے خرمن ظلم واستبداد پر گرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب خدا نے عصا اور ید بیضا کی صورت میں ان کو یہ صاعقہ ہلاکت دیا اور انہوں نے اپنے بھائی ہارون کی اعانت کا سوال کیا تو خدا نے اسے پورا کیا:

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا

(۳۵:۲۸)

خدا نے کہا: میں تیرے دست و بازو کو تیرے بھائی کی اعانت سے قوی کردوں گا اور تم دونوں کو فرعون پر غالب کروں گا۔

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے آغاز کار سے انجام کار تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا اور دعوت موسوی کے ہمیشہ شریک وامین رہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا اقدام قربانی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اسی سلسلہ کو اور ترقی ہوئی۔ پہلے خدا کے ایک صالح بندے نے اپنے بیٹے کو خدا کی مرضی پر قربان کرنا چاہا تھا لیکن اب وہ وقت آیا کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے قربانی کے جام مقدس کے طرف ہاتھ بڑھایا اور ان کے لیے سولی کا جو تختہ تیار کیا گیا تھا۔ اس کی طرف بلا کسی باک (خوف) کے بڑھے:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴:۱۵۷)

اور ان لوگوں نے نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا، نہ پھانسی دی، بلکہ ان پر اس قربانی کی حقیقت مشتبہ ہوگئی۔

جہاد کی ابتدا و تکمیل

لیکن اسلام کے زمانہ تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوئی تھیں، وہ محض شخصی حیثیت رکھتی تھیں، یعنی انبیاء علیہ السلام نے شخصی طور پر خدا کی ذات پر اپنی اولاد کو یا اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ جہاد کی یہ ابتدا تھی، مگر اس کی تکمیل شریعت اسلام پر موقوف تھی۔ چنانچہ اسلام نے جس طرح عقائد و عبادات اور معاش و معاد میں تمام قدیم مذاہب کی تکمیل کی، اسی طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کر دیا۔

قربان گاہ حق میں عدیم النظیر قربانی

اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ شخصی طور پر بھی جو قربانیاں کی گئیں، وہ راہ ہی میں روک لی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لخت جگر کو خدا کی نذر کرنا چاہا، لیکن اس کا موقع ہی نہ آیا، حضرت عیسیٰؑ سولی کی طرف بڑھے، لیکن بچا لئے گئے۔ آج تک تمام خاندان نبوت نے متفقہ طور پر اس میں شرکت بھی نہیں کی تھی اور اس کی کوئی نظیر تمام سلسلہ انبیاء میں نہیں نظر آئی تھی کہ صرف بھائی، صرف بیٹا، صرف بیوی ہی نے مقصد نبوت میں ساتھ نہ دیا ہو، بلکہ بلا تمیز خاندان نبوت کے اکثر اعضا و ارکان راہ حق میں قربان ہوئے ہوں۔

میدان کربلا میں تکمیل سرفروشی

یزید کی شخصی خلافت کی بیعت کے لیے جو ہاتھ بڑھے تھے، وہ اسلام کی جمہوریت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے اور مذہب کی قربانیاں صرف امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہی کے لیے ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے جب اسوۂ ابراہیمی کے زندہ کرنے کا ٹھیک وقت آ گیا تو خاندان نبوت کے زن ومرد، بال بچے، غرض ہر فرد نے اس میں حصہ لیا اور جن قربانیوں کے پاک خون سے زمین کی آغوش اب تک خالی تھی ان سے کربلا کا میدان رنگ گیا۔

پس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے اس کا تعلق صرف اسلام کی تاریخ ہی سے نہیں، بلکہ اسلام کی اصل حقیقت سے ہے۔ یعنی وہ حقیقت جس کا حضرت اسماعیل رضی اللہ عنہ کی ذات سے ظہور ہوا تھا اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ رضی اللہ عنہ کی ذات تک پہنچ کر گم ہوگئی، اس کو حضرت حسینؓ نے اپنی سر فروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندان نبوت، دنیا کے آباد کرنے کے لئے ہمیشہ اجڑتا رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھر بار چھوڑا، حضرت عیسیٰ رضی اللہ عنہ نے آوارہ گردی کی اور نبوت محمدی کے متبعین میں سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے میدان کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام سے خاندان نبوت کا سلسلہ ملا ہوا ہے، انھوں نے ایک وادی غیر ذی زرع میں شدت تشنگی سے ایڑیاں رگڑی تھیں۔ حضرت حسینؓ نے بھی میدان کربلا میں اس خاندانی روش کو زندہ کیا۔

یادگاروں کا قیام دائمی

قومی عظمتوں کا راز

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے، وہ اس واقعہ کی یادگار اور اس کا دائمی تذکار ہے۔

دنیا میں ہر قوم نے اپنے ماضی کے اُن واقعات وحوادث کی ہمیشہ تعظیم کی ہے جن کے اندر قوم وملک کے لیے کوئی غیر معمولی تاثیر یا عبرت پائی جاتی تھی اور ہمیشہ ان انسانی بڑائیوں اور عظمتوں کی یاد کو یادگاروں، تہواروں، عمارتوں، تاریخوں، قومی روایتوں اور قومی مجمعوں کے انعقاد کے ذریعہ زندہ رکھنا چاہا ہے، جن کے اندر خود اس قوم کی کوئی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے۔

مشاہیر پرستی کی اختراع

یہی چیز ہے جس کو تمام اقوام متمدنہ نے "مشاہیر پرستی" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور یہی چیز ہے کہ ہر قوم اپنی قومیتوں کے بڑے بڑے بانیوں، مذہبی معلموں، محبّ الوطنوں اور قومی شہیدوں کی یاد کو کبھی بھی مفقود ہونے نہیں دیتی۔

قیام یادگار کے قدیمی طریقے

ہومر نے الیڈ لکھی، کالڈیا کے حجری کتب خانے[2] میں وہ اینٹیں رکھی گئیں جن پر نامورانِ ملت کے مناقب ومحامد کندہ تھے، عرب جاہلیت نے اپنے سلسلہ انساب کا ایک حرف ضائع ہونے نہ دیا اور ذوالحجیہ اور عکاظ میں اسلاف کے مفاخر ومعالی کی داستان سرائی قائم کی۔ مصریوں نے ایسے ایسے مینار بنائے جو ہزاروں برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولین کی طرح محکم واستوار ہیں اور پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو حنوط (ممی) کر کے محفوظ کر دیا۔ ہندوستان نے مہا بھارت کے معرکے کو قومی روایتوں میں داخل کر دیا اور والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوام قدیمہ کے یہ تمام اعمال صرف اسی حقیقت کے لیے تھے کہ اسلاف ومشاہیر کی یاد زندہ وقائم رکھی جائے۔

خوشنما ودلفریب شکل یادگار

آج اوقیانوس کا بحری مسافر واشنگٹن کے بت کو ساحل امریکہ پر دیکھ کر دور سے پکار اٹھتا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے شہروں اور ان کی محکوم نوآبادیوں کی شاہراہوں اور باغوں میں جا بجا سنگی بت نصب نظر آتے ہیں، شیکسپیر کا مولد اب تک قائم ہے، ملٹن کی میز کو مرنے نہیں دیا جاتا، جانسن کے آثار اب بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ میلان میں ایک جگہ یہ سنگی کتبہ تم پڑھو گے: ''پاک میزینی نے یہاں اپنا بچپن گذارا تھا''۔

یہ سب کچھ بھی اسی مشاہیر پرستی کی ایک زیادہ خوشنما ودل فریب شکل ہے، جو پہلے محض قومی روایتوں اور افسانہ طرازیوں کے ذریعہ قائم رکھی جاتی ہے۔

ظاہری شکل وصورت

لیکن یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اس تذکار و یادگار کا اصلی مقصد کسی واقعہ کو محض یاد رکھنا، یا کسی نام کو فراموش نہ ہونے دینا ہی نہیں تھا، بلکہ کچھ اور ہی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر یہ مقصد ہوتا

تو اس کے لیے کسی خاص نام، کسی خاص واقعہ، کسی خاص حادثہ میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ تھی۔ پچھلوں کو اگر محض یاد ہی رکھنا ہے، تو اس کے لیے بڑا اور چھوٹا، ادنیٰ و اعلیٰ، نیک و بد، سب یکساں ہیں۔ کونسی وجہ ہے کہ کارتھیج کے مشہور ھنے بال کو یاد رکھا جائے اور ٹیٹس کو یاد نہ رکھا جائے جو اسی عہد میں گذرا تھا؟

احیائے کارہائے نمایاں

سو وہ اصلی روح حقیقت جو اجتماع انسانی کی اس سب سے زیادہ پرانی رسم کے اندر کام کر رہی ہے، دراصل ناموں، وجودوں، شخصیتوں اور محض تذکرہ و یاد آوری سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس سے اصلی غرض یہ تھی کہ جو اعمال حسنہ، عزائم مہمہ، نتائج عظیمہ اور بصائر و مواعظ جلیلہ ان مشاہیر اور ناموروں کی زندگی سے وابستہ ہیں اور جن کی یاد اور تذکرہ کے اندر قوموں اور ملکوں کے لیے سب سے زیادہ موثر اور نافذ دعوت عمل و اتباع ہے، ان کی یاد ہمیشہ حی و قائم رکھا جائے اور مختلف ذریعوں سے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن کی وجہ سے کبھی بھی آئندہ نسلیں ان اعمال حسنہ کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہ دیں۔

اعمال اور سچائیوں کی یادگار

پس یادگار دراصل انسانی افراد کی نہ تھی، بلکہ انسان کے بہترین اعمال کی تھی اور تذکرہ و یاد آوری شخصوں اور حادثوں کی نہ تھی، بلکہ ان سچائیوں کی تھی جو وہ اپنی زندگی کے اندر رکھتے تھے۔

عظمت انسانی

خدا نے ذات کی بڑائی اور عظمت صرف اپنی ہی کبریائی کے لیے مخصوص کر لی ہے اور دنیا کو جو کچھ دیا گیا ہے، وہ صرف "عمل" کی بڑائی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان بڑا نہیں

ہوسکتا، اس لیے کہ بڑا صرف ایک ہی ہے اور وہ: فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے۔ البتہ عمل بڑا ہوسکتا ہے اور اس کی بڑائی سے اس کے حامل کے اندر بھی نسبتی اور اضافی بڑائی آجاتی ہے۔

استنباط قرآنی

پس ساری تعظیمیں، ساری تقدیسیں، ہر طرح کا احترام و شرف جو دنیا میں کیا جاسکتا ہے، یا تو خدا کے لیے ہے یا پھر خدا کی سچائی اور اس کے قرار دیئے ہوئے اعمال حسنہ کے لیے۔ خود انسان کی ذات کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالِمِیْنَ میں الحمد کے الف لام کا یہی مطلب ہے، جسے میں نے آغاز تقریر میں تلاوت کیا اور:

اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْباً وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (۴۹:۱۳)

ہم نے تم لوگوں کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہاری ذاتیں اور قومیں اس لیے مقرر کر دی ہیں کہ تم ایک دوسرے کو شناخت کرسکو، بلاشبہ تم میں سے اللہ کے ہاں معزز و مکرم وہی ہے جو تم میں سے عملاً اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔

سے اسی پر روشنی پڑتی ہے اور:

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (۳:۱۸۸)

یہ بدبخت چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف و توصیف ان اعمال کی بنا پر کی جائے جو انھوں نے نہیں کیے حالانکہ "حمد" کا استحقاق تو اعمال ہی کو تھا۔

اسی کو مزید توضیح کرتا ہے:

وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (۲۹:۴۳)

لیکن اہل علم و بینش ہی ان دانشمندانہ حقیقتوں کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک عالمگیر غلطی

لیکن دُنیا کا خسران صرف اسی میں نہیں ہے کہ وہ سچائی کی طرف نہیں بڑھتی، بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ بسا اوقات اس کی جانب قدم اٹھاتی ہے، پر ایسا ہوتا ہے کہ راہ ہی میں گم ہو جاتی ہے اور جس طرح اس کی طرف نہ چل کر اس سے محروم تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس کی طرف چل کر بھی محروم رہتی ہے۔

خسران بزبان قرآن

کیا تم نہیں دیکھتے کہ قرآن حکیم نے انسان کے نقصان و خسران کے جو مختلف حالات بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک زیادہ عام اور زیادہ پیش آنے والی حالت کے لیے ضلالت کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی سورۂ فاتحہ میں ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِم'' کے ساتھ ایک اور گروہ کا باسم ''الضَّآلِّيْنَ'' تذکرہ کیا گیا ہے۔

سب سے بڑی تباہی و بدحالی

''ضلالت'' کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ تم کو معلوم ہے کہ ''گمراہی'' اور ''راستے میں بھٹک جانے'' کے ہیں۔ اسی لیے متحیر اور غیر متعین نظر رکھنے والے پر بھی ''ضال'' کا اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ کوئی متعین راہ اس کے سامنے نہیں ہوتی۔

پس قرآن کریم نے نوع انسانی کی بدحالی و تباہی کی سب سے بڑی عام حالت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا اور اس میں بڑا نکتہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کو اٹھنے اور چلنے سے انکار نہیں

ہوتا۔ وہ سفر تو کرتا ہے، پر ہوتا یہ ہے کہ منزل مقصود کی حقیقی شاہراہ اس پر نہیں کھلتی اور وہ راہ ہی میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔

تحبط اعمال سے مقصود

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باوجود چلنے کے منزل مقصود سے اسی طرح محروم رہتا ہے، جس طرح وہ شقی و جاحد محروم رہا، جس نے چلنے کا قصد ہی نہیں کیا تھا۔ یہی حقیقت اصطلاح قرآنی میں "تحبط اعمال" کی ہے۔ جس پر جا بجا مختلف پیرایوں میں زور دیا گیا ہے کہ:

فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۸:۱۰۵)

ان کی تمام محنتیں، کوششیں اور راہروی کی مشقت بالکل اکارت گئی اور اس کا کوئی پھل انھیں نہ ملا۔

ہلاکت بخش گمراہی

چنانچہ اس "ضلالت" عمل کی ایک عمدہ مثال دنیا کی عالمگیر "مشاہیر پرستی" بھی ہے، جو مقصد کے لحاظ سے ایک نہایت، اہم، عظیم المنفعت، حیات پرور اور سعادت بخش حقیقت تھی، لیکن باایں ہمہ اس بارے میں ہمیشہ قوموں نے غلطی کی اور اکثر حالتوں میں سخت ٹھوکر کھائی۔ وہ دنیا کی عالمگیر ضلالت کبریٰ جو اس کے ہر عمل میں حقیقت اور مقصد کو فنا کرتی اور ظواہر و رسوم کی اس سے پوجا کراتی ہے، افسوس کہ اس حقیقت کے لیے بھی ہلاکت بخش ہوئی اور گمراہیوں اور حقیقت ناشناسیوں سے اس طرح اس عمل عظیم کو آلودہ کر دیا گیا کہ بسا اوقات ہدایت کی جگہ ضلالت کا ایک بہت بڑا پتھر ثابت ہوئی!

قرآن اور قیامِ یادگار

انسان کی ایک عالمگیر غلطی

ہماں عشق ست برخود چیدہ چندیں داستاں ورنہ
کسے برمعنی یک حرف صد دفتر نمی سازد!

انسان کی ایک عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی روح کے لیے اختیار کرتا ہے، لیکن آگے چل کر صرف اس کے جسم ہی کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ مشاہیر وسلف پرستی کا اصلی مقصد تو اعمال حسنہ کی یاد اور نیکی وصداقت کے عملی نمونوں کو پیروی واتباع کے لیے قائم رکھنا تھا۔ لیکن نتیجہ بالعموم یہ نکلا کہ اعمال کی یاد مٹ گئی اور محض انسانوں کی شخصیتوں اور ناموں کی پوجا ہونے لگی۔ یعنی وہ چیز کہ کسی دوسرے مقصد کے لیے واسطہ وذریعہ تھی، خود ہی مقصود بالذات بن کر لوگوں کے عقائد واعمال مین جاگزیں ہوگئی اور حقیقت سے اس قدر بعد ونسیان ہوگیا کہ محض رسوم واسماء کی عظمت و پرستش ہی پر ہر شخص قانع ہوگیا!

بت پرستی کا ذریعہ

یہی وجہ ہے کہ مشاہیر پرستی بسا اوقات دنیا میں بت پرستی کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اعمال کی جگہ افراد واسماء کی پرستش محض نے دو تین نسلوں کے بعد انسان کو بت پرستی تک پہنچا دیا۔

اُسوۂ حسنہ

اے برادران ملت! یہی حقیقتِ اعلیٰ ہے جسے قرآن حکیم نے "اُسوۂ حسنہ" کے جامع و مانع لفظ سے تعبیر کیا ہے اور یہی مقام ہے جہاں آ کر اسلام کی قوت اصلاح اور ختم نبوت کی اصلی علت آشکارا ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے دنیا کی تمام صداقتوں کو لے لیا؟ اور ساتھ ہی کس طرح ان تمام خرابیوں اور ضلالتوں سے محفوظ بھی کر دیا، جن کے اختلاط و آلودگی سے ان کی روح حقیقت اور تاثیرِ عمل بالکل فنا ہو گئی تھی؟

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ (۴۲:۴۱)

قرآن ایک ایسا معلم و ہادی ہے کہ نہ تو اس کے آگے باطل جم سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے اسے جگہ مل سکتی ہے۔ وہ خدائے حکیم وحمید کا اتارا ہوا ہے، پھر باطل کا یہاں کیا گذر؟

اعتقادِ انسانی کی تقدیس

ہاں، باطل کیونکر اب اس کے ساتھ مل سکتا ہے جبکہ وہ "حق خالص" ہے اور سچائی کے ساتھ جس قدر بھی گمراہی ملا دی گئی تھی، اس سے انسان کے ہر اعتقاد و عمل کو بالکل صاف و پاک کر دیا ہے؟ نیز جا بجا قرآن حکیم کو "ہادی" کہا کہ وہ انسان کو اس کے سفر اعمال میں ٹھوکروں اور گمراہیوں سے بچاتا ہے اور اسی طرح "شفا" کہا، کیونکہ وہ مثل مفید و نافع ادویہ کے ہے جو مریض کی اصلی قوت طبیعی کو مزید توانائی اور نشو ونما دیتی ہیں اور مضر اثرات مرض جو داخل طبیعت ہو گئے ہیں، ان کو دور کر دیتی ہیں!

معنی اُسوہ

''اُسوہ'' کہتے ہیں کسی فکر، کسی عمل، کسی وصف، کسی خاصہ کے ایک ایسے نمونے کو، جسے تم اس لیے اپنے سامنے رکھ لو کہ اس کی پیروی اور نقل کرو گے اور اس کی سی باتیں اپنے اندر بھی پیدا کرنا چاہو گے۔

طبیعت انسانی کا خاصہ

انسانی سعادت کے لیے تعلیم محض بالکل بیکار ہے، جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے نہ ہوں۔ جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیت پر ایک انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے، وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اخلاق کی کتابیں اپنی موثر تعلیمات سے انسانوں کو رلا دے سکتی ہیں، مگر اس کے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔ عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں مین بیڑیاں ڈال دے سکتا ہے، لیکن اس کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بروں کی بڑی بڑی برائیاں بتلا دے سکتے ہیں، لیکن کسی برے انسان کو نیک نہیں بنا سکتے:

بڑھتا ہے اور ذوق گُنہ یاں سزا کے بعد!

قوت اسوہ وقدوہ

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک اور مزکی انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو اور اس کے اعمال حیات راست بازی کے لیے ''اسْوہ'' کا حکم رکھتے ہوں، تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر، نہ صرف افراد و اشخاص کو، بلکہ اقوام و امم کے اعمال کو یکسر پلٹ دے سکتا ہے!

تعلیم ربانی اور اس کا عملی پیکر

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لیے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا، بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا (کہ ان کے حامل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلا دیا۔ وہ جس دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے، اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک اور مطہر زندگی تھی۔ اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی تو بصورت و جودی و قائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جا سکتی تھی۔ اگر اس کی آیات بینات حروف و اصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں، تو انبیاء کرام کی زندگی عمل و فعل کے اندر سے اس کی تصویر دکھلا دیتی تھی۔ اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہیے تو حیات نبوت ثابت کر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا اور اس طرح کیا جا سکتا ہے!

قرآن اور خُلقِ نبوی ﷺ کی یکسانیت

یہی حقیقت ہے جس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس وقت بیان کیا تھا جبکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اعمال کا حال پوچھا گیا تھا کہ ''کان خلقہ القرآن'' اگر تم ان کے خلق عظیم کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو قرآن کو دیکھ لو۔ یہاں حروف و الفاظ ہیں، وہاں ایک پیکر مجسم تھا۔ یہاں قوت ہے، وہاں فعل تھا۔ یہاں چراغ ہے، وہاں اس کی روشنی تھی۔ حقیقت ایک ہی ہے جس نے ایک جگہ علم کی اور دوسری جگہ عمل کی صورت پائی ہے!!

کتاب و سنت کا مفہوم

اور یہی وجہ ہے کہ ''سنت'' کتاب کا ایک حقیقی جزو اور مفہوم ''کتاب'' میں تبعاً داخل ہے۔ کوئی علیحدہ اور مستقل وجود نہیں رکھتی۔ جو ظاہر میں اس حقیقت سے بے خبر ہیں، وہ

قرآن کے ساتھ "حدیث" کا لفظ سنتے ہیں تو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ "حدیث" کی پیروی کا مطالبہ ایسا مطالبہ ہے جو "قرآن" کے علاوہ ایک دوسری قوت کا اثبات کرتا ہے۔ حالانکہ "سنت" کی اطاعت "کتاب" کی اطاعت میں داخل ہے اور "سنت" علم قرآنی ہی کی عملی تفسیر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دعویٰ

اور اگر یہ سچ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خوارج ومنکرین کے مقابلہ میں فرمایا تھا کہ "میں قرآن ناطق ہوں" تو میں اس کی تصدیق کرنے کے لیے تیار ہوں، اگرچہ حقیقت ناشناس طبیعتیں سمجھتی ہیں کہ یہ بہت بڑا دعویٰ تھا۔ یقیناً یہ بڑے سے بڑا دعویٰ تھا جو کوئی انسان کر سکتا ہے، لیکن اگر حضرت امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا تو غلط نہ تھا۔ اگر ان کی مقدس زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا ایک کامل عکس تھی اور ان کے اعمال کی روشنی سراج منیر رسالت ہی سے ماخوذ تھی، تو کیوں انھیں یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے تئیں "قرآن ناطق" کہیں؟

ثبوت دعویٰ حضرت علیؓ

جو کتاب الٰہی مابین الدفتین حروف ونقوش کی شکل میں تھی، اسی کی ہستی ناطق تھی جو اعمال حضرت مرتضوی کے اندر سے پکارتی تھی۔ خوارج سمجھتے تھے کہ یہ علی ابن ابی طالبؓ کی آواز ہے، لیکن ابوذر اور سلمان کی حقیقت شناسی جانتی تھی کہ یہ علی ابن ابی طالب کی آواز نہیں ہے بلکہ "القرآن الحکیم" کی صدائے الٰہی ہے اور چونکہ "القرآن" کی آواز ہے، اس لیے یقیناً خود منزل القرآن کی آواز ہے:

كنت سمعه الذى يسمع به و لسانه الذى يتكلم به (بخارى)

تعلیمات قرآنی کی حقیقت اساسی

بہرحال یہ مبحث بجائے خود محتاج تفصیل ونظر ہے۔ مختصر یہ کہ سعادت و ہدایت انسانی کے لیے "تعلیم" کے ساتھ "نمونہ" اور "کتاب" کے ساتھ "سنت" ایک ضروری حقیقت ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے اپنی تعلیمات کے لیے اس چیز کو ایک اساسی حقیقت قرار دیا:

قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)

بلاشبہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور ہدایت آیا اور کتاب الٰہی جس کی تعلیم بالکل واضح وروشن ہے!

اس آیت کریمہ میں "نور" سے مراد حامل قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود اقدس ہے اور "کتاب مبین" قرآن ہے۔ یہ "نور" وہی "اسوۂ حسنہ" ہے جو حامل قرآن کی مقدس زندگی میں "علم" قرآنی کا وجود "عملی" تھا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳:۲۱)

بلاشبہ تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی واتباع کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔

عمومی وخصوصی معنی اُسوَہ

عربی میں "اسوہ" کا لفظ ہر نمونے کے لیے کہا جاتا ہے اور نمونہ جس طرح خیر کا ہوسکتا ہے اسی طرح شر کا بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے "حسنہ" کے لفظ سے اسے متصف کیا۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ فضائل ومحاسن ہی کا نمونہ مقصود ہے۔ اسی طرح تمہیں معلوم ہے کہ سورۂ ممتحنہ میں بھی دو جگہ ملت حنیفی وفطری کے اولین مؤسس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہی لفظ آیا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۴:۶۰)

بے شک تمہارے لیے ایک بہترین نمونہ ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے اعمال زندگی میں ہے۔

عود الی المقصود

دنیا میں اعمال مقدسہ وحسنہ کی یادگار قائم کرنے کا مقصد بھی یہی "اسوۂ حسنہ" تھا یعنی جن لوگوں نے کسی پاک واعلیٰ عمل کا بہترین نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے، ان کی یاد کو ہمیشہ باقی رکھا جائے، تاکہ ان کی یاد کے ساتھ ان کے اعمال کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے اور اس کا نمونہ انسانوں کو عزائم امور کی طرف دعوت دے۔

رسوم وظواہر پرستی کی بیخ کنی

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے کس طرح دنیا کی اس قدیم ترین رسم کی اصلی حقیقت لے لی اور کس طرح اس کی آلودگیوں کو اس سے بالکل الگ کر دیا؟ اس نے یادگاروں کے لیے پتھر کے بت نہیں بنائے جن کو حوادث ارضی کا ایک طمانچہ گرا دے سکتا ہے اور جن کا وجود انسان کی عظمت کے لیے ایک سخت داغ تھا۔

اس نے اینٹ اور چونے کی عمارتیں نہیں بنائیں جو طوفان وبرق کے ایک حملے کی بھی تاب نہیں لاسکتیں اور جن کا اثر ظواہر سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس نے سالانہ مجمعوں اور قومی تقریبوں پر زور نہیں دیا کیونکہ یہ وسائل ہمیشہ ظواہر ورسوم پرستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور یادگار کی معنویت مفقود ہو جاتی ہے۔

وسائل تذکار کا انتخاب

غرضکہ اس نے ان تمام وسائل تذکار سے یک قلم انکار کر دیا جو عام طور پر تمام قوموں

میں رائج تھے اور جن کے ذریعہ خود انسانوں کی بڑائی تو کی جا سکتی تھی، پر عمل کی تقدیس و تعظیم کے لیے ان کے اندر کچھ نہ تھا اور اس لیے ہمیشہ ان کا وجود انسان کی حقیقت پرستی کی راہ میں ایک سخت پتھر ثابت ہوا تھا۔

سورۂ کریمہ فاتحہ

اے عزیز من!

اب میں تمام تمہیدوں اور مقدمات کی مبادیات سے گذر کر اصل موضوع کے قریب آ گیا ہوں اور مجھے زیادہ تیز قدمی کرنی چاہیے۔ مجھے یاد کرنا چاہیے کہ میں نے اپنی تقریر کو سورۂ مبارکہ ''فاتحہ'' کی تلاوت سے شروع کیا تھا جسے بظاہر آج کی صحبت سے کوئی ربط نہ تھا، مگر وہ ''السبع المثانی'' ہے، وہ تمام ''الکتاب'' کا متن ہے اور وہ اس کی تمام تفصیلات کا وجود اجمالی ہے، پھر ہدایت انسانی کا کونسا مقام ہے جو قرآن کے سلطان احاطہ سے باہر رہ گیا ہو؟

غرض کہ قرآن حکیم نے یادگار و تذکار کے ان تمام رسمی و ضلالت آمیز طریقوں سے انکار کر دیا جو عام طور پر دنیا نے اختیار کر لیے تھے۔

قرآنی تعلیمات کا جزو اعظم

لیکن جبکہ اس نے وہ سب کچھ نہ کیا جو سب کوئی کرتے آئے تھے، تو سوال یہ ہے کہ خود اس نے کیا کیا؟

اس نے ''اسوۂ حسنہ'' کی اصلی حقیقت کو اپنی تمام تعلیمات کا جزو اعظم بنایا اور اس کی یادگاروں کو انسان سے کے باہر نہیں جن کو انسان چھوڑ دے سکتا ہے بلکہ خود انسان کے اندر قائم کر دیا جو کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ اس نے مادی و جسمانی اعمال و

اشکال کے اندر اس کی دعوت عمل وسعادت کو گم نہیں کر دیا، جیسا کہ گم کر دی گئی تھی، بلکہ اس کو ایک خالص معنوی وروحانی اعتقاد بنا کر اس طرح دلوں کے اندر قائم کر دیا کہ اس کی حقیقت دائمی طور پر زندہ ہوگئی اور ہر طرح کی آلودگیوں اور رسم پرستیوں کی آمیزش سے بالکل محفوظ ومصئون بنا دی گئی!

سب سے بڑی نعمت طلبی کی تلقین

قرآن نے سب سے پہلے ہمیں ایک مقدس ''دعا'' بتلائی اور حکم دیا کہ دن میں پانچ مرتبہ جب اپنے پروردگار کے حضور بندگی ونیاز کے لیے حاضر ہوتو سب سے پہلے اسی دعا کو پڑھو۔ یہ وہ وقت ہوگا جب تم رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوگے اور اس کی رحمت کا دروازہ باز ہوگا۔ پس ایک عاجز ودرماندہ انسان: فاطر السمٰوات والارض کے حضور جاکر اپنے لیے سب سے بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی دولت جو مانگ سکتا ہے، وہ اس دعا میں مانگی گئی ہے اور چاہیے کہ تم اسی نعمت کے سائل، اسی مطلوب کے طالب اور اسی محبوب کے عاشق ہو!

سورۂ فاتحہ اور صراط مستقیم

یہ ''دعا'' سورۂ فاتحہ ہے جو ہر مومن دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت کے اندر پڑھتا ہے اور وہ نعمت، وہ دولت، وہ متاع مطلوب ومحبوب ''الصراط المستقیم'' ہے جس کے مانگتے رہنے اور طلب کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (فاتحہ)

خدایا! تو ہمیں الصراط المستقیم پر چلنے کی توفیق دے!

انعام یافتہ لوگوں کی راہ

یہ ''الصراط المستقیم'' کونسی راہ ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کی یہاں کوئی تشریح نہیں کی گئی۔ البتہ یہ بتلایا گیا ہے کہ:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (فاتحہ)

ان لوگوں کی راہ جن پر اے پروردگار تو نے انعام کیا

پس اس تصریح سے صراط مستقیم وہ راہ ہوئی جو ''انعام یافتہ'' لوگوں کی راہ ہے۔ یعنی جن لوگوں پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں، انہی کی راہ عمل صراط مستقیم ہوگی۔

انعام یافتہ لوگ اور ان کے مدارج

چنانچہ سورۂ نساء میں ''انعام یافتہ'' جماعتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ: اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں کن لوگوں کی طرف اشارہ تھا ؟

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (۴: ۶۹)

اور جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، تو وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر خدا نے انعام کیا ہے، اور وہ نبی ہیں، صدیق ہیں، شہید ہیں اور (تمام) نیک اور راستباز انسان ہیں۔ اور (جس کسی کے ساتھ ایسے لوگ ہوں تو) ایسے ساتھی کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

صراط مغضوبیت وضلالت سے بیزاری

اس آیت کریمہ نے صاف صاف بتلا دیا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس '' الصراط المستقیم '' کے تعین کے لیے صرف اس قدر اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ ''انعام یافتہ لوگوں کی

راہ" ہے، وہ کون لوگ ہیں؟ نیز ان کے مختلف مدارج و مقامات کیا کیا ہیں؟ جن جماعتوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اور انھیں "انعام یافتہ" کہا ہے، انہی کی راہ عمل، وہ راہ ہدایت و سعادت ہوگی جس کا نام لسانِ الٰہی نے "الصراط المستقیم" رکھا ہے اور جس پر چلے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم "مغضوب علیھم" اور "الضالین" کی صراط مغضوبیت و ضلالت سے الگ نہیں ہوسکتی۔

متفق علیہ تفسیر و تشریح

سورۂ نساء کی اس آیت کریمہ سے "انعمت علیھم" کی مزید تفسیر و تشریح کرنا، ایک ایسی مسلم اور متفق علیہ تفسیر ہے جسے عہد صحابہ و اہل بیت نبوت (رضوان اللہ علیہم) سے لے کر طبقات متاخرہ تک، تقریباً تمام ارباب علم و رسوخ نے اختیار کیا ہے اور مفسرین "خاصہ" و "عامہ" سب نے اسے قبول کیا ہے۔ چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کئے ہیں، اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبرسی (صاحب تفسیر مجمع البیان) بھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس عاجز نے تفسیر "البیان" میں تصریحات حضرات ائمہ کرام علیہم السلام و اقوال مفسرین خاصہ بھی نقل کر دئے ہیں:

فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ۔[۲]

انعام یافتہ لوگوں کے چار گروہ

بہر حال یہ آیت کریمہ بتلاتی ہے کہ جس راہ پر چلنے کی سورۂ فاتحہ میں ہر مومن التجا کرتا ہے، وہ راہ "انعام یافتہ" گروہ کی ہے۔ انعام یافتہ گروہ چار ہیں:

۱ الانبیاء

۲ الصدیقون

۳ الشہداء

۴ الصالحون

مشاہیر پرستی کی حقیقی راہ

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے یادگار و تذکار کے اصلی مقصد کو تمام آلودگیوں اور ضلالتوں سے صاف کر کے کس طرح قائم کر دیا ہے اور اس کے لیے کیسی دائم و قائم اور محفوظ و مصئون راہ اختیار کی ہے؟ اس نے نیک انسانوں اور اعلیٰ ترین ہستیوں کی یادگاریں زمین پر قائم نہیں کیں، لیکن ان کے اعمال کو ہر مومن کے دل پر نقش کر دیا۔ اس نے ہر مومن باللہ پر پانچ وقت کی نماز فرض کی اور حکم دیا کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرو!

سعادت کونین کی التجاء

سورۂ فاتحہ کیا ہے؟ تحمید و تقدیس کے بعد ایک التجا ہے جو انسان اپنے خداوند کے حضور کرتا ہے۔ وہ التجا کیا ہے؟ ''الصراط المستقیم'' پر چلنے کی التجا ہے تا کہ اس راہ کی اسے توفیق ملے اور سعادت کونین حاصل ہو۔

استحقاق انعام کے حصول کی راہ

اب اور آگے بڑھو اور دیکھو کہ ''الصراط المستقیم'' کونسی راہ ہے جسے ہر روز دن میں پانچ بار ہر مومن یاد کرتا اور اپنے خدا کے حضور جا کر مانگتا ہے؟ فرمایا کہ وہ ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ یہاں اس راہ کا طریق حصول یا اس کے عقائد و اعمال نہیں بتلائے گئے بلکہ صرف ان لوگوں کی طرف توجہ دلا دی گئی۔ جنھوں نے ایسے عقائد، ایسے اعمال، ایسے عزائم، ایسے اقدام کئے تھے جن کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرے تھے۔

راہ حقیقت کی تلاش میں گم گشتگی

یہی چیز ''یادگار'' ہے۔ یہی ''تذکار'' ہے۔ یہی وہ ''مشاہیر پرستی'' کی حقیقت اصلی ہے جس کو تمام دنیا نے ڈھونڈا مگر نہ پایا۔ وہ کبھی پتھر کے بتوں، کبھی اینٹوں کی عمارتوں، کبھی انسانوں کے مجموں، کبھی ملکوں اور قوموں کی وقتی رسموں اور تقریبوں میں بھٹک کر رہ گئی اور

''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ'' کی جگہ ''الضَّآلِّيْن'' کی صراط پر چلی گئی!

عمل صالح کی زندگی کی تحریک

عزیزان من!

''مشاہیر پرستی'' کے زوائد واباطیل کو چھوڑ دو، صرف اس کی اصلی حقیقت کو اپنے سامنے لاؤ۔ وہ کیا ہے کیا صرف یہی نہیں ہے کہ جن انسانوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دئے ہیں اور نیکی وصداقت کی راہ پر چلے ہیں، ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے، تاکہ ان کی یاد ان کے مقدس کاموں اور نیک عملوں کی یاد کو تازہ کردے اور اس یادآوری وتازگی سے قوموں کے لیے پاک ارادوں اور اعلیٰ کاموں کے کرنے کی تحریک ہو؟ اگر یہی ہے تو کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورۂ فاتحہ کے اندر یہی حقیقت کس طرح کارفرما ہے؟

راہ سعادت کیا ہے؟

سورۂ فاتحہ نے انسان کی راہ سعادت وترقی کے لیے نہ تو عقائد وافکار بیان کئے اور نہ اعمال وافعال، بلکہ ان انسانوں کی طرف توجہ دلائی جو انعام یافتہ الٰہی تھے یعنی جو انسان راہ سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ انعام یافتہ انسانوں کی یاد کو ہر روز اپنے سامنے لائے اور ان کے عقائد واعمال کے نمونے کو کبھی فراموش نہ کرے۔ پھر اگر یہ دنیا کی پاک عمل ہستیوں کی سچی یادگار اور ان کا حقیقی تذکار نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یقیناً یہ تذکار ہے، مگر ایسا تذکار جو اپنے خصائص کے لحاظ سے تمام دنیا میں کوئی نظیر نہیں رکھتا!

قصص القرآن کی غرض

پھر ان انعام یافتہ لوگوں کی تشریح کی کہ وہ انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں، صالحین ہیں، پھر ان میں سے ہر گروہ کے وہ اعمال حسنہ جا بجا قرآن حکیم میں مشرح بیان

کیے، جن سے "الصراط المستقیم" کی راہ سعادت متعین ہوتی ہے۔ قصص القرآن کی اصلی غرض اسی "اَنعَمتَ عَلَیھِم" کی تفسیر سمجھو۔ یہ چار گروہ وہ ہیں جن کے اندر نوع انسانی کا تمام اصلح واسعد حصہ آ گیا اور انسانی عمل کی سچائی جب کبھی ظاہر ہوگی، تو ضرور ہے کہ انہی انعام یافتہ چار جماعتوں میں سے کسی جماعت سے متعلق ہو۔

عجیب وغریب حقیقت

پس غور کرو کہ تم یادگار یادگار پکار رہے ہو، تمام دنیا مشاہیر پرستی کے لیے بے قرار ہے، کرہ ارضی کی ہر متمدن انسانی جماعت، انسانی بڑائیوں کا تذکار کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ کیسی یادگار کی عجیب و غریب خالص حقیقت ہے، جو اس کی تمام خرابیوں کو دور کر کے قرآن حکیم نے ہمیں عطا کی ہے؟

استحقاق تذکار کی وسعت پیمائی

دنیا کی ہر قوم صرف اپنے ہی بڑوں کو تذکار کا مستحق سمجھتی ہے اور زیادہ سے زیادہ چند بڑے انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے کرہ ارضی کی تمام حقیقی بڑائیوں اور اعمال صالحہ کے تمام گھرانوں کو چن لیا اور حکم دیا کہ تم ان سب نمونوں کو اپنے سامنے رکھو اور سب سے بڑے بڑے کاموں، بڑے بڑے عزموں، بڑی بڑی نیکیوں سے اپنی راہ ایمان واسلام کو مرکب ومقوم بناؤ۔

یادگاری کی یاد تازہ اور منزل مقصود

تم یادگاریں بنا کر سال میں ایک مرتبہ انھیں یاد کر سکتے ہو اور عمارتی وسنگی اشکال میں کبھی کبھی ایک غلط انداز نظر ڈال لے سکتے ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے تذکار کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ لیکن دیکھو، تمہارے قرآن نے کیسی یادگار قائم کی جو ہر روز دن میں پانچ مرتبہ ہر مومن انسان کے سامنے آتی ہے اور صرف ایک ہی بڑے انسان کو نہیں، بلکہ تمام راست باز انسانوں کو جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین میں گزرے، وہ یاد کرتا اور ان کے اعمال مقدسہ کے نمونوں پر چل کر راہ سعادت کی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے!

موعظت و عبرت آموزی کا سبق

صحبت ماتم کی یاد تازہ

شمع ھا بُردہ ام از صدق بخاک شُھداء

تادِل و دیدۂ خونبانہ فشانم دادند!

آیئے، سب سے پہلے آج ایک بھولی ہوئی صحبت ماتم کو پھر تازہ کریں۔ کتنے دن گذر گئے کہ راہ و رسم ماتم و شیون سے نا آشنا ہیں۔ نہ صدائے ماتم کی فغاں سنجی ہے اور نہ چشم خونبار کی اشک افشانی۔ کاروبار غم کی رونق افسردہ ہو چلی ہے اور روز بازار درد کی چہل پہل مدت سے موقوف ہے:

نہ داغ تازہ می خارد نہ زخم کہنہ می کارد!

بدہ یارب دلے کیں صورت بے جاں نمی خواہم!

طرابلس کے خون آلود ریگستان کو اگر لوگوں نے بھلا دیا، مشہد مقدس اور تبریز کا قصہ الم اگر ذہنوں سے محو ہو گیا، مقدونیا اور البانیہ کے تازہ ترین افسانہ ہائے خونین، اگر فکروں سے فراموش ہو گئے، تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ارباب درد و غم کے لیے ایک ایسی داستان الم صدیوں سے موجود ہے، جو کبھی بھلائی نہیں جا سکتی اور اگر لوگ اسے بھلا بھی دیں تو بھی ہر سال چند ایسے ماتم آلود دن تازگی زخم کہن کے لیے آ موجود ہوتے ہیں جو از سر نو ایک ہزار ڈھائی سو برس پیشتر کے ایک حادثہ عظیمہ کی یاد پھر سے تازہ کر دیتے

ہیں۔اس سے ...... میرا اشارہ حادثۂ ہائلۂ کبریٰ یعنی شہادت حضرت سید الشہداء رضی اللہ عنہ کی طرف ہے۔

عظم الله اجور نابمصائبنا!

مرثیہ وقت

وقت ست کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی — سوزد نفس نوحہ گراز تلخ نوائی

وقت است کہ آن پردگیاں، کزرہ تعظیم — بردرگہ شاں کردہ فلک ناصیہ سائی

ازخیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند — چوں شعلۂ دخاں برسر شاں کردہ ردائی

جانہا ہمہ فرسودۂ تشویش اسیری — دلہا ہمہ خوں گشتہ اندوہ رہائی

تنہاست حسینؓ ابن علیؓ درصف اعداء

اکبر تو کجا رفتی، و عباس کجائی؟

الہام سرائی عبرت وبصیرت

سچ یہ ہے کہ جن مردہ دلوں کو زندگی کی لیے سوز وتپش کی ضرورت ہو، جن ارباب درد کو روح کی راحت کے لیے جسم کے ماتم کی تلاش ہو، جن کی زبانیں آہ و فغاں کو محبوب اور جن کی آنکھیں خونبانہ فشانی کو اپنا مطلوب و مقصود سمجھتی ہوں، ان کی صحبت ماتم والم کی رونق کے لیے یہی افسانہ اتنا کچھ سامان غم اپنے اندر رکھتا ہے کہ اگر خون کے بڑے بڑے سیلاب سمندروں کی روانی سے بہہ جائیں اور بے شمار لاشوں کی تڑپ سے زمین کے بڑے بڑے قطعات یکسر جنبش میں آجائیں، جب بھی ان کی نداءِ حال اس الہام سرائی سے قاصر رہے گی، جو اس کے ایک ایک لفظ کے اندر سے توصیہ فرمائے عبرت وبصیرت ہے۔

حقیقی بصائر و معارف نمائی

لیکن آہ، کتنے دل ہیں جنھوں نے اس واقعہ کو اس کے حقیقی بصائر و معارف کے اندر دیکھا ہے؟ اور کتنی آنکھیں ہیں، جو حسینؓ ابن علیؓ شہید پر گریہ و بکا کرتے ہوئے اس اسوۂ حسنہ کو بھی سامنے رکھتی ہیں، جو اس حادثہ عظمیٰ کے اندر موجود ہے؟

محبّ حسینؓ کی شناخت

فی الحقیقت یہ حق و صداقت، آزادی و حریت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک عظیم الشان انسانی قربانی تھی جو صرف اس لیے ہوئی تا کہ پیروان اسلام کے لیے ایک اسوۂ حسنہ پیش کرے اور اس طرح جہاد حق و عدالت اور اس کے اثبات و استقامت کی ہمیشہ کے لیے ایک کامل ترین مثال قائم کر دے۔ پس جو بے خبر ہیں ان کو رونا چاہیے۔

ان لم تبکو ا فتباکوا

اور جو روتے ہیں ان کو صرف رونے ہی پر اکتفانہ کرنا چاہیے۔ ان کے سامنے سید الشہداء نے اپنی قربانی کا ایک اسوۂ حسنہ پیش کر دیا ہے اور کسی روح کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ محبت حسینؓ کی مدعی ہو، جب تک کہ اسوۂ حسینی کی متابعت کا اپنے اعمال کے اندر سے ثبوت نہ دے!

ضرورت تھی کہ ایک مبسوط مقالہ افتتاحیہ "اسوۂ حضرت سید الشہداء کے عنوان سے کئی نمبروں میں لکھا جاتا اور نہایت تفصیل کے ساتھ اس حادثہ ہائے ہائلۂ شہادت پر نظر ڈالی جاتی۔ سب سے پہلے اس کی تاریخی حیثیت نمایاں کی جاتی اور اس کے بعد ان تمام مواعظ و نتائج عظیمہ کو ایک ایک کر کے بیان کیا جاتا جو اس ذبح عظیم کے اندر پوشیدہ ہیں اور جن کی لسان حیات آج بھی اس طرح صدا دے رہی ہے جس طرح کنار فرات

کی ریتلی سرزمین پر اب سے بارہ سو برس پہلے زخم وخون کے اندر سے وعظ فرمائے حقیقت وصداقت تھی!!

حیات الٰہیہ کی روح

دنیا میں ہر چیز مرجاتی ہے کہ فانی ہے۔مگر خون شہادت کے ان قطروں کے لیے جو اپنے اندر حیات الٰہیہ کی روح رکھتے ہیں، کبھی بھی فنا نہیں:

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگرست

لیکن افسوس شرح وبسط کے لیے اس وقت مستعد نہیں۔صرف چند مجمل اشارات پر اکتفا کروں گا:

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

پہلی موعظت

سب سے پہلا نمونہ جو یہ حادثہ عظیمہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے،"دعوت الی الحق" اور حق وحریت کی راہ میں اپنے تیئں قربان کرنا ہے۔

غیر شرعی اور اسلامی حکومت

بنی امیہ کی حکومت ایک غیر شرعی حکومت تھی۔کوئی حکومت جس کی بنیاد جبر وشخصیت پر ہو، کبھی بھی اسلامی حکومت نہیں ہوسکتی۔انہوں نے اسلام،روح حریت وجمہوریت کو غارت کیا اور مشورہ واجتماع امت کی جگہ محض غلبہ جابرانہ اور مکروخدع پر اپنی شخصی حکومت کی بنیاد رکھی۔ان کا نظام حکومت شریعت الٰہیہ نہ تھا، بلکہ محض اغراض نفسانیہ ومقاصد سیاسیہ،ایسی حالت میں ضرور تھا کہ ظلم وجبر کے مقابلہ کی ایک مثال قائم کی جاتی اور حق و

حریت کی راہ میں جہاد کیا جاتا۔

حکومت جابرہ کی وفاداری سے انکار

حضرت سید الشہداء نے اپنی قربانی کی مثال قائم کرکے مظالم بنی امیہ کے خلاف جہاد حق کی بنیاد رکھی اور جس حکومت کی بنیاد ظلم و جبر پر تھی، اس کی اطاعت و وفاداری سے انکار کردیا۔

پس یہ نمونہ تعلیم کرتا ہے کہ ہر ظالمانہ و جابرانہ حکومت کا علانیہ مقابلہ کرو اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و وفاداری کی بیعت نہ کرو جو خدا کی بخشی ہوئی انسانی حریت و حقوق کی غارت گر ہو اور جس کے احکام مستبدہٗ جابرہ کی بنیاد صداقت و عدالت کی جگہ جبر و ظلم پر ہو۔

دوسری موعظت

مقابلے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تمہارے پاس قوت و شوکت مادی کا وہ تمام ساز و سامان بھی موجود ہو جو ظالموں کے پاس ہے۔ کیونکہ حسینؓ ابن علیؓ کے ساتھ چند ضُعفاء و مساکین کی جمعیت قلیلہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حق و صداقت کی راہ نتائج کے فکر سے بے پرواہ ہے۔ نتائج کا مرتب کرنا تمہارا کام نہیں۔ یہ اس قوت قاہرہ عادلہ الٰہیہ کا کام ہے، جو حق کو باوجود ضعف و فقدان انصار کے کامیاب و فتح مند کرتی اور ظلم کو باوجود جمعیت و عظمت دنیوی کے نامراد و نگوں سار کرتی ہے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲:۲۴۹)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر حکم الٰہی سے غالب آ گئیں!

نفس خادع کی حیلہ تراشی

ایسے موقعوں پر ہمیشہ مصلحت اندیشیوں کا خیال دامنگیر ہوتا ہے جو فی نفسہ اگر چہ عقل و دانائی کا ایک فرشتہ ہے، لیکن کبھی کبھی شیطان رجیم بھی اس کے بھیس میں آ کر کام کرنے لگتا ہے۔ نفس خادع حیلہ تراشیاں کرتا ہے کہ صرف اپنے تئیں کٹوا دینے اور چند انسانوں کا خون بہا دینے سے کیا حاصل؟ توپ وتفنگ اور تخت وسلطنت کا مقابلہ کس نے کیا ہے کہ ہم کریں؟

مسکت جواب

آخری سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ تاریخ عالم کی صدہا امثال مقدسہ ومحترمہ جہاد سے قطع نظر، تمہارے سامنے خود مظلوم کربلا کی مثال موجود ہے۔ تم کہتے ہو کہ چند انسانوں نے حکومتوں کی قوتوں اور ساز وسامان کا مقابلہ کب کیا ہے کہ کبھی بھی کیا جائے؟ میں کہتا ہوں کہ حسین ابن علیؓ نے صرف بہتر (۷۲) یا باسٹھ (۶۲) بھوکے پیاسے انسانوں کے ساتھ اس عظیم الشان حکومت قاہر و جابر کا مقابلہ کیا، جس کے حدود سلطنت ملتان اور سرحد فرانس تک پھیلنے والے تھے۔

ظلم واستبداد کی حکومت

اور گو یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل کے ٹکڑوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپتے دیکھا اور پھر ایک ایک کر کے ان میں سے ہر وجود مقدس خاک و خون میں تڑپا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ دشمنوں سے نہ تو پینے کے لیے پانی چھین سکا اور نہ زندہ رہنے کے لیے اپنی غذا حاصل کر سکا اور اس میں بھی شک نہیں کہ بالآخر سر سے لے کر پیر تک وہ زخموں

سے چور ہوا اور اس خلعت شہادت لالہ گوں سے آراستہ ہو کر تیار ہوا، تا اس کرشمہ ساز عجائب کے حریم وصال میں پہنچے، جو دوستوں کو خاک و خون میں تڑپاتا اور دشمنوں کو مہلت دیتا ہے:

اريد وصاله' ويريد قتلي!

خون مظلومیت کی فتح مندی

تاہم فتح اس کی تھی اور فیروزمندی و کامرانی کا تاج صرف اسی کے زخم خوردہ سر پر رکھا جا چکا تھا۔ وہ تڑپا اور خاک و خون میں لوٹا، پھر اپنے اس خون کے ایک ایک قطرہ سے جو عالم اضطراب میں اس کے زخموں سے ریگ و سنگ پر بہتا تھا، انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب ہائے آتشیں پیدا کر دیئے، جن کو نہ تو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی، نہ حجاج کی بے امان خونخواری اور نہ عبدالملک کی تدبیر و سیاست۔ وہ بڑھتے اور بھڑکتے ہی رہے۔ ظلم و جبر کا پانی تیل بن کر ان کے شعلوں کی پرورش کرتا رہا اور حکومت و تسلط کا غرور ہوا بن کر ان کی ایک ایک چنگاری کو آتشکدہ سوزاں بناتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری وقت آ گیا اور جو کچھ ۶۱ھ میں کربلا کے اندر ہوا تھا، وہ سب کچھ ۱۳۲ھ میں نہ صرف دمشق، بلکہ تمام عالم اسلامی کے اندر ہوا۔ صاحبان تاج و تخت خاک و خون میں تڑپے، ان کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں، فتح مندوں نے قبروں تک اکھاڑ ڈالیں اور مُردوں کی ہڈیوں تک کو ذلت و حقارت سے محفوظ نہ چھوڑا اور اس طرح:

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶ : ۲۲۷)

بہت جلد ظالم لوگ اس بات کو جان لیں گے کہ کس جگہ وہ سب لوٹائے جائیں گے۔

کا پورا پورا ظہور ہوا۔

معجز نما فتح مندی

پھر کیا یہ سب کچھ جو ہوا، وہ محض ابراہیم عباسی کی دعوت اور ابومسلم خراسانی کی خفیہ ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ تھا؟ کیا یہ اسی خون کا اعجاز نہ تھا جو فرات کے کنارے بہایا گیا تھا؟ پھر یہ فتح مندی تو بہ حسب ظاہر ہے جس کے نتائج کے لیے ایک صدی کا انتظار کرنا پڑا، ورنہ فی الحقیقت مظلومیت کا خون جس وقت بہتا ہے، اُسی وقت اپنی معنوی فتح مندی حاصل کر لیتا ہے۔

تیسری موعظت

بہر حال یہ تو حق و صداقت کی قربانیوں کے نتائج ہیں جو کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے، لیکن حضرت سید الشہداء کا اُسوۂ حسنہ بتلاتا ہے کہ تم ان نتائج کی ذرا بھی پرواہ نہ کرو۔ اگر ظلم اور جابرانہ حکومت کا وجود ہے، تو اس کے لیے حق کی قربانی ناگریز ہے اور اسے ہونا ہی چاہیے۔ تعداد کی قلت کثرت یا سامان وسائل کا فقدان اس پر موثر نہیں ہوسکتا اور ظلم کا صاحب شوکت وعظمت ہونا اس کے لیے کوئی الٰہی سند نہیں ہے کہ اس کی اطاعت ہی کر لی جائے۔ ظلم خواہ ضعیف ہو خواہ قوی، ہر حال میں اس کا مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ ظلم ہے اور حق و صداقت ہر حال میں یکساں اور غیر متزلزل ہے۔

چوتھی موعظت

حق و عدالت کی رفاقت کی آزمائشیں زہرہ گداز اور شکیب ربا ہیں۔ قدم قدم پر حفظ جان و ناموس اور محبت فرزند و عیال کے کانٹے دامن کھینچتے ہیں۔ لیکن یہ اُسوہ حسنہ مومنین مخلصین کو درس دیتا ہے کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی طلب و ہمت کو اچھی طرح

آزمالیں۔ نہ ہو کہ چند قدموں کے بعد ہی ٹھوکر لگے:

جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست!

راہ الٰہی میں قرار واقعی امتحانات

اس قتیل جادۂ حق و صداقت کے چاروں طرف جو کچھ تھا، اس کا اعادہ ضروری نہیں کہ سب کو معلوم ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی آزمائشوں کے متعدد درجے بیان کئے ہیں:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ، قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (۲:۱۵۵۔۱۵۶)

اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائشوں میں ڈالے گا۔ وہ حالت خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان مال و جان اور ہلاکت اولاد و اقارب میں مبتلا کر کے، تمہارے صبر و استقامت کو آزمائے گا، پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے ان کے لیے، جن کے ثبات و استقامت کا یہ حال ہے کہ جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے تمام معاملات کو یہ کہہ کر اللہ کے سپرد کردیتے ہیں کہ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

خوف و ہراس، بھوک اور پیاس، نقصان اموال و متاع، قتل نفس و اولاد، یہی چیزیں انسان کے لیے اس دنیا میں انتہائی مصیبتیں ہوسکتی ہیں، اس لیے انہی چیزوں کو راہ الٰہی کے لیے آزمائش قرار دیا گیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عظمت

لیکن مظلوم کربلا کے سامنے یہ تمام مرحلے ایک ایک کر کے موجود تھے، وہ ان تمام

مصائب سے ایک لمحہ کے اندر نجات پا کر آرام وراحت اور شوکت وعظمت حاصل کر سکتا تھا اگر حکومت ظالمہ کی وفاداری واطاعت کا عہد کر لیتا اور حق وصداقت سے رُوگردانی کے لیے مصلحت وقت کی تاویل پر عمل کرتا، پر اس نے خدا کی مرضی کو اپنے نفس کی مرضی پر ترجیح دی اور حق کا عشق، زندگی اور زندگی کی محبتوں پر غالب آ گیا۔ اس نے اپنا سر دے دیا کہ انسان کے پاس حق کے لیے یہی ایک آخری متاع ہے، پر اطاعت واقرار وفاداری کا ہاتھ نہ دیا جو صرف حق وعدالت ہی کے آگے بڑھ سکتا تھا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ، وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (۲:۲۰۷)

اور جو لوگ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اپنی جانیں تک فروخت کر دیتے ہیں اور اللہ بھی اپنے بندوں کے لیے شفقت ومہربانی رکھنے والا ہے۔

پانچویں موعظت

سب سے بڑا اُسوۂ حسنہ کہ اس حادثۂ عظیمہ کی لسان حال اس کی ترجمانی کرتی ہے، راہ مصائب وجہاد حق میں صبر واستقامت اور عزم وثبات ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۱:۳۰)

بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہی ہے اور پھر اس بات پر قائم رہے

دوسری جگہ کہا:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ! وللہ در ما قال:

بس چاہیے کہ جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے (اے نبی) قائم رہیں! اپنی راہ میں استوار ہو جاؤ! (۱۱:۱۱۲)

رُوئے کشادہ باید و پیشانی فراخ
آں جا کہ لطمہ ہائے ید اللہ می زنند

سب سے بڑی مزیت وخصوصیت

فی الحقیقت اس شہادت عظیمہ کی سب سے بڑی مزیت وخصوصیت یہ ہے کہ اپنے تمام عزیز وا قارب، اہل وعیال اور فرزند واحباب کے ساتھ دشت غربت ومصائب میں محصور اعدا ہونا، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشوں کو شدت عطش وجوع سے آہ فغاں کرتے ہوئے دیکھنا، پھران میں سے ایک ایک کی خون آلود لاش کو اپنے ہاتھوں اٹھانا، حتیٰ کہ اپنے طفل شیر خوار کا بھی تیر ظلم و بربریت سے نخچیر پانا، مگر بایں ہمہ راہ عشق وصداقت میں جو پیمان صبرو استقامت باندھا تھا، اس کا ایک لمحہ بلکہ ایک عشر دقیقہ کے لیے بھی متزلزل نہ ہونا اور حق کی راہ میں جس قدر مصائب واندوہ پیش آئیں، سب کو شکر ومنت کے ساتھ برداشت کرنا کہ:

رضینا بقضاء اللہ و صبر ناعلیٰ بلائہ

پیکان ترا بجانِ خریدار
من مرہم دیگراں نخواہم

زہر کو شہد پر ترجیح

دوست کے ہاتھ سے جام زہر بھی ملتا ہے تو تشنہ کامان زلال محبت اسے غیروں کے جام شہد وشکر پر ترجیح دیتے ہیں:

اے جفاہائے تو خوشتر زوفائے دگراں!

آج بھی اگر گوش حقیقت نیوش باز ہو تو خاک کربلا کا ایک ایک ذرہ توصیہ فرمائے صبرو استقامت ہے:

شدیم خاک و لیکن بوئے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد!

اسفار تاریخ کی تائید

افسوس کہ تفصیل مطالب کا ارادہ نہیں اور وقت و گنجائش مقتضی اجمال و ایجاز۔ اگر اس صبر و استقامت کے اسوۂ حسنہ کو دیکھنا چاہتے ہو تو خدارا اسفار تاریخ کی طرف توجہ کرو۔ صرف ایک روایت یہاں لکھوں گا، تا کہ جو لوگ خاندان نبوت اور عترت حضرت رسالت کی محبت کا دعویٰ رکھتے ہیں، وہ غور کریں کہ ادعاء محبت بغیر متابعت بیکار ہے:

ان المحب لمن یحب یطیع !

امام زین العابدینؒ کی شہادت

حضرت امام علی بن الحسین الشہیر بہ زین العابدین کہتے ہیں:

انی لجالس فی العشیة التی قتل ابی الحسین فی صبیحتها و عمتی زینب تمرضنی اذدخل ابی وهو یقول :

یا دھر، اف لك من خلیل	کم لك فی الاشراف والاصیل
من طالب و صاحب قتیل	والدھر لایقنع بالبدیل
وانما الامر الی الجلیل	وکل حی سالك السبیل

ففهمت ماقال، و عرفت ماراد، و خنقتنی عبرتی، ورددت دمعی، وعرفت ان البلاء قد نزل بنا. واما عمتی زینب، فانها لما سمعت ما سمعت و النساء من شانهن الرقه و الجزع، فلم تملك ان و ثبت تجر ثوبها حاسرة وهی تقول و اثکلاه ! لیت الموت اعدمنی الحیاة، الیوم ماتت فاطمه و علی و الحسن بن علی اخی، فنظر الیها فردد غصة ثم قال :

یا اختی ! اتقی اللّٰہ! فان الموت نازل لامحالة فلطمت و جهها وشقت

جیبھا، و خرت مغشیاً علیھا، وصاحت و اویلاہ! واثکلاہ !! فتقدم الیھا فصب علیٰ وجھھا الماء وقال لھا یا اختاہ ! تعزی بعزاء اللّٰہ، فان لی ولکل مسلم اسوۃ برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم "[۳]

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت امام علیؓ بن حسین زین العابدینؒ کہتے ہیں:

جس رات کی صبح کو میدان شہادت گرم ہونے والا تھا، عین اسی شب کا واقعہ ہے کہ میں بیمار پڑا تھا۔ میری پھوپھی زینب میری تیمارداری میں مصروف تھیں۔ اتنے میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ داخل ہوئے۔ وہ چند اشعار پڑھ رہے تھے جنہیں سن کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے؟ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم پر ابتلاء الٰہی نازل ہو گئی ہے اور اب اس سے چارہ نہیں۔

مگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا ضبط نہ کر سکیں، کیونکہ قدرتی طور پر عورتیں زیادہ رقیق القلب ہوتی ہیں: وہ ماتم کناں چلا اٹھیں کہ:

واحسرتا ! وامصیبتا! الیوم ماتت فاطمہؓ و علیؓ و الحسنؓ بن علیؓ!

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھی تو ان کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا اے بہن! یہ کیا بے صبری اور کیسا جزع وفزع ہے؟ اللہ سے ڈرو کہ موت یقیناً ایک آنے والی چیز ہے اور اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا اشدت غم وحزن سے مضطر تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ آنے والی صبح کن واقعات خونین کے ساتھ طلوع ہوگی۔ فرط غم میں انھوں نے اپنا چہرہ پیٹ لیا، گریبان پھاڑ ڈالا اور واویلا! واحسرتا! پکارتی ہوئی بے ہوش اپنے بھائی پر گر پڑیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ حالت دیکھ کر ان کے منہ پر پانی ڈالا اور جب ہوش میں آئیں تو فرمایا:

اے بہن! یہ کیسا غم وحزن ہے جو تم کر رہی ہو؟ تمہیں چاہیے کہ اللہ کے حکم وفرمان کے مطابق جو عزا وحزن وغم ہے، اسے اختیار کرو، کیونکہ میرے لیے اور ہر ایک مسلم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے اعمال وافعال میں اتباع اور پیروی کے لیے بہترین نمونہ ہے!!

اُسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر

اللہ اکبر! خاندان نبوت کے اس مرتبہ رفیع اور اس درجہ عظیم کو دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ کس طرح ان کے سامنے تھا اور:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲۱:۳۳)

بے شک رسول اللہ کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے پیروی اور اتباع کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

کے حکم کے آگے کس طرح انھوں نے اپنے جذبات اور خواہشوں کو قربان کر دیا تھا؟ ایسے سخت اور زہرہ گداز موقع پر بھی اپنی بہن کا جزع فزع انھیں گوارا نہ ہوا اور بجائے عام الفاظ صبر و تشفی کہنے کے فرمایا تو یہ فرمایا کہ:

فان لی ولکل مسلم اُسوۃ فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !!

پھر آج کتنے مدعیان محبت اہل بیت کرام ہیں، جو اس اُسوۂ حسنہ کے اتباع کا اپنے اعمال سے ثبوت دے سکتے ہیں؟

واقعہ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اگر سلطان اسلام کو خلیفہ مان لینا چاہیے گو نا اہل ہو، تو پھر حضرت امام حسینؓ نے یزید بن معاویہؓ کی حکومت کے خلاف کیوں خروج کیا؟ اور کیوں ان کو برسر حق اور شہید ظلم وجور تسلیم کیا جاتا ہے؟

ایک غلطی کا ازالہ

پس گو بحث کے اس حصے کا طول بقیہ مطالب کی تشریح میں مخل ہوگا لیکن چونکہ اس معاملہ میں عام طور پر ایک سخت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، اس لیے صاف کردینا ضروری ہے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اس حالت میں لڑے، جبکہ وہ یزید کی حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں انہوں نے واقعہ کربلا کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ اس غلط فہمی کا پیدا ہوجانا عجیب نہیں۔ حضرت امام جب مدینہ سے چلے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ جب کربلا میں حق پرستانہ لڑ کر شہید ہوئے، تو ان کی حیثیت دوسری تھی۔ دونوں حالتیں مختلف ہیں اس لیے دونوں کا حکم بھی شرعاً مختلف ہے۔

پہلی حیثیت

جب وہ مدینہ سے چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی، نہ اہم مقامات ومراکز نے اس کو خلیفہ تسلیم کیا تھا، نہ اہل حل وعقد کا اس پر اجماع ہوا تھا۔ ابتداء سے معاملہ خلافت میں سب سے پہلی آواز اہل مدینہ کی رہی ہے' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مدینہ کی جگہ کوفہ دارالخلافہ بنا۔ اہل مدینہ اس وقت تک متفق نہیں ہوئے تھے ۔کوفہ کا یہ حال تھا کہ تمام آبادی یک قلم مخالف تھی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے کے لیے پیہم اصرار والحاح کر رہی تھی۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص نہ کی بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے خالی ہو چکا تھا اور نئے حکمران کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، ایک بہت بڑی مرکزی وموثر آبادی (یعنی کوفہ و عراق) کے طلب وسوال کو منظور کرلیا۔ البتہ اس منظوری میں مصلحت ضرور پیش نظر تھی کہ یزید جیسے نااہل کی حکومت سے امت کو بچایا جائے۔

اگر کہا جائے کہ امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً اولاد کی ولی عہدی کوئی شے نہیں ہے۔ اصلی شرط خلافت کی انعقاد حکومت ہے۔ یزید کو گو ولی عہد مقرر کر دیا ہو، لیکن جب تک اس کی خلافت بالفعل قائم نہ ہو جاتی صرف یہ بات کوئی حجت نہ تھی ۔یہی وجہ ہے کہ جب یزید کو ولی عہدی کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیعت طلب کی گئی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

لا ابایع لا میرین

میں دو امیروں سے بیک وقت بیعت نہ کروں گا۔

یعنی خلیفہ کا اپنی زندگی میں ولی عہدی کے لیے بیعت لینا ایک وقت میں دو امیروں کی بیعت ہے جس کی شرعاً کوئی اصل نہیں۔ (رواہ ابن حبان ونقلہ فی الفتح)

دوسری حیثیت

لیکن جب وہ کوفہ پہنچے تو یکا یک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے۔ تمام اہل کوفہ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کے لیے بیعت کر چکے ہیں اور سرزمین عراق کی وہ بے وفائی و غداری جو حضرت امیر کے عہد میں بارہا ظاہر ہو چکی تھی، بدستور کام کر رہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر وہ معاملۂ خلافت سے دست بردار ہو گئے اور فیصلہ کر لیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں۔ لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مع اہل و عیال کے قید کرنا چاہا۔ وہ اس پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ مدینہ کی جگہ دمشق چلے جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرا لیں۔ مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا۔

دو راہیں

اب امام کے سامنے صرف دو راہیں تھیں یا اپنے تئیں مع اہل و عیال قید کرا دیں یا مردانہ وار لڑ کر شہید ہوں۔ شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرا دے۔ پس انہوں نے دوسری راہ کمال عزیمت و دعوت کی اختیار کی اور خود فروشانہ لڑ کر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے۔

پس جس وقت کربلا میں میدان کارزار گرم ہوا ہے اس وقت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مدعی خلافت و امامت نہ تھے، نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے۔ ان کی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جس کو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنے آپ کو زندہ گرفتار کرا دینا پسند نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ طاقتور ظلم کے مقابلے میں بے سروسامان حق کی استقامت کا ایک یادگار منظر دنیا کو دکھلا دے۔ تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے جس کو مفصل اور محققانہ بحث دیکھنی ہو، وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی منہاج السنہ جلد ۲ کا مطالعہ کرے۔

❋ ❋ ❋

حواشی

۲۔ حجری کتب خانے سے مقصود تمدن بابل و کالڈیا کا وہ عہد مدنی ہے، جبکہ کتابیں پتوں اور درخت کی چھالوں کی جگہ پتھر پر کندہ کرکے لکھی گئیں اور جن کا بڑا ذخیرہ بابل کے آثار عتیقہ میں موجود ہے۔

یہ نوٹ اگرچہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ شذرات کی جگہ پورا افتتاحیہ ہے تاہم چونکہ سرسری طور پر لکھا گیا ہے اس لیے اسے الہلال کا "لیڈنگ آرٹیکل" قرار نہیں دیتا

۳۔ تاریخ یعقوبی مطبوعہ لنڈن ج۔ ۲، ص، ۲۹۰

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ

مولانا ابوالکلام آزادؒ

Design
0333-4349801



مکتبۂ جمال

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Mob. 0300-8834610 Tel .042-7232731
maktaba_jamal@email.com/maktabajamal@yahoo.co.uk